گماں کا ممکن

[جو تو ہے میں ہوں]

ن م راشد

اِدارہ
ہور
کستان

گماں کا ممکن

ن

م

راشد

گماں کا ممکن

[جو تو ہے میں ہوں]

ن ۔ م ۔ راشد

نیا ادارہ
۱۵ ۔ سرکلر روڈ
لاہور
پاکستان

طبع اول

اکتوبر ۱۹۷۶ء

تعدادِ اشاعت : ایک ہزار

ناشر : مشتاق احمد چودھری

مطبع : سویرا آرٹ پریس

۱۵ - سرکلر روڈ ، لاہور

پاکستان

فہرست

آخری مجموعہ ، آخری ملاقات

اس وقت یہ کہاں معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے ۔

ٹیلی فون پر ان کا اصرار تھا کہ وقت نکال کر ایک روز کے لیے چیلٹینھیم آؤ اور مل کر جاؤ ۔ میں نے کہا ''لندن میں صرف چند روز کا قیام ہے اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں ۔ آپ آ جائیے ۔'' راشد ہنس کر بولے ''میں نہیں آ سکتا ۔ میں ض ضعیف آدمی ہوں ۔ تم آ جاؤ ۔'' پھر میری مجبوریوں کا احساس کرتے ہوئے مان گئے اور طے یہ پایا کہ اگلے روز وہ کوچ سے لندن آئیں گے اور میں سہ پہر کو اڑھائی بجے وکٹوریہ کوچ اسٹیشن پر ان کا انتظار کروں گا ۔

اس سے پچھلے برس جب میں لندن میں ان سے ملا تھا تو وہ یو این او کی ملازمت سے فارغ ہوکر انگلستان آ چکے تھے اور عارضی طور پر لندن میں مقیم تھے ۔ انھوں نے لندن کے مشہور محلے چیلسی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا اور سوچ رہے تھے کہ لندن کے مضافات میں کہیں گھر خرید کر وہیں بس جائیں ۔ ان کی بیگم شیلا کی بھی یہی خواہش تھی مگر مضافات میں ابھی کسی موضع کا انتخاب نہ ہوا تھا ۔ کوشش یہ تھی کہ ایسی جگہ گھر خریدا جائے جہاں بچے کی تعلیم کے لیے مناسب اسکول بھی ہو ۔ اس مرتبہ میں لندن آیا تو وہ یہاں سے کوئی سو میل دور چیلٹینھیم کے خوب صورت قصبے میں جا بسے تھے ۔

وکٹوریہ اسٹیشن پر وہ کوچ کے سب مسافروں کے بعد اترے ۔ دیکھنے میں چاق و چوبند لگتے تھے ۔ چہرے اور جسم کی توانائی سے صحت اچھی معلوم ہوتی تھی ۔ بولے ''لندن صرف تم سے ملنے آیا ہوں اس لیے قیام کا سارا وقت تمھاری نذر ہوگا ۔ بس ایک مختصر سا کام کرنا ہے ۔ وہ یہ کہ پاکستانی سفارت خانے سے زندہ نامہ لینا ہے ۔''

''زندہ نامہ کیا چیز ہے ؟''

''اب میری گزر دو پنشنوں پر ہے ۔ یو این کی پنشن الگ ہے جو گزر اوقات کے لیے وافر ہے ۔ حکومتِ پاکستان کی جو ملازمت کی تھی اس کی پنشن بھی ملتی ہے جس کی رقم اتنی نہیں ہوتی کہ ہر مہینے اسے حاصل کیا جائے ، اس لیے چھ مہینے کے بعد وصول کرتا ہوں ۔ اسے حاصل کرنے کے لیے سفارت خانے سے اس امر کی شہادت مہیا کرنا ہوتی ہے کہ میں ابھی زندہ ہوں ۔ چنانچہ اس کاغذ کو میں زندہ نامہ کہتا ہوں ۔"

سفارت خانے کی تیسری منزل تک کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ان کی سانس پھول گئی ۔ زندہ نامہ حاصل کیا گیا ۔ اب چاء کا وقت ہو چکا تھا ۔ براپٹن روڈ کے ایک اطالوی قہوہ خانے کی ایک چھوٹی سی میز پر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے ۔ شیلا اٹلی کی رہنے والی ہیں ۔ راشد صاحب نے اطالوی بیرے کو ایک ایسے سینڈوچ کا آرڈر دیا جو اطالوی ماکولات سے خاص ہے ۔ میں نے انھیں چھیڑتے ہوئے کہا ''اس ریستوران میں تو آپ کو خانۂ مسرال کے مزے آ رہے ہوں گے ۔"

لندن عجیب شہرِ ناپرساں ہے لیکن وہاں بزم سجانے کے لیے گروہ کی نہیں ، صرف ایک اور کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ایک ہم دم ہو تو کافی ہے اور ہم دمِ دیرینہ ہو تو سبحان اللہ ۔ اس میز پر دو گھنٹے میں ہم نے دنیا جہان کی باتیں کر ڈالیں ۔ راشد صاحب نے اس گفتگو میں دو تین مرتبہ بڑھاپے کا ذکر کیا اور کہا "ساری عمر سفر میں بسر کی ہے لیکن اب بڑھاپے نے مجھے نروس کر دیا ہے ۔ سفر مجھے کچھ پریشان کرنے لگا ہے ۔ نیویارک میں بخاری مرحوم یہی کہا کرتے تھے تو بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر اب معلوم ہو رہا ہے کہ اطبا نے ٹھیک کہہ رکھا ہے کہ مرضِ کہولت کا کوئی علاج نہیں ۔"

"لیکن راشد صاحب ، آپ نہ عمر کے حساب سے بوڑھے ہیں ، نہ شکل صورت سے بوڑھے لگتے ہیں ۔ اور جس ملک میں آپ رہتے ہیں وہاں تو آدمی اسّی برس کی عمر میں بوڑھا ہو تو ہو ، اس سے پہلے تو وہ اس لفظ کو بھی قبول نہیں کرتا ۔''

"ٹھیک کہتے ہو مگر میں یہاں کا بوڑھا نہیں ہوں ۔ جس طرز میں بچپن گزرا ، زندگی کے متعلق بزرگوں سے جو سنا ، جن خیالات کے سہارے جوانی

بسر کی ، جس جسمانی اور روحانی غذا پر جسم و جان نے پرورش پائی وہ سب یہاں کے لوگوں سے مختلف ہے ۔ میں یہاں کا بوڑھا کیسے ہوسکتا ہوں؟‘‘

’’اچھا یہ بتائیے کہ چیلٹنہیم میں کیسی گزر رہی ہے ؟‘‘

’’ایک گھر شیلا کی پسند کا خرید لیا ہے ۔ علاقہ بہت خوب صورت ہے ۔ میں صبح اٹھ کر سیر کو جاتا ہوں ۔ یہ قصبہ بوڑھے انگریزوں اور بالخصوص ریٹائرڈ فوجی افسروں کا مامن ہے ۔ سیر کے دوران میں ان سے سلام سلام ہوتی ہے ، ٹوپی ہلائی جاتی ہے ۔ کبھی کبھی ”گڈ مارننگ“ وغیرہ کے مراحل سے گزر کر مختصر سی گفتگو بھی ہو جاتی ہے ۔ اُن میں سے اکثر اپنی ملازمت کا زمانہ برِصغیر میں بسر کر چکے ہیں ۔ چنانچہ پٹنہ ، پُونا اور پشاور کا تذکرہ یوں کرتے ہیں جیسے دیارِ محبوب کا ذکر ہو رہا ہو ۔ اکثر بڈھے انگریز یہی کہتے ہیں کہ ہائے ہمارا بس چلتا تو عمر کا یہ حصہ بھی وہیں بسر کرتے ۔ میں بھی ٹوپی ہلاتا ہوا گزر جاتا ہوں اور دل میں کہتا ہوں بڑے میاں ، آپ کو مغالطہ ہو رہا ہے ۔ نہ پونا کو یاد کر رہے ہو نہ پشاور کو ، یہ شہر تو بس جوانی کو یاد کرنے کا بہانہ ہیں کہ وہ گلیاں یاد آتی ہیں ۔

واپسی پر راستے سے دو چار اخبار خریدتا ہوں ۔ گھر پہنچ کر بیوی بچوں کے ساتھ ناشتہ کرتا ہوں ۔ بچہ اسکول چلا جاتا ہے ۔ بیوی گھر کے کام کاج میں لگ جاتی ہے اور میں پڑھائی لکھائی کے کام پر بیٹھ جاتا ہوں ۔ مگر اب وہ دم نہیں رہا ۔ جلدی تھک جاتا ہوں ۔ کام کرتا ہوں ، پھر اونگھنے لگتا ہوں ۔ اونگھتا ہوں ، پھر کام کرتا ہوں ۔ آج کل امیر خسرو پر ایک مضمون لکھنا چاہتا ہوں لیکن نہ میرے پاس خسرو کا مکمل کلام موجود ہے ، نہ حوالے کی کتابیں دستیاب ہیں ۔ جب نظم بنتی ہے تو شعر لکھتا ہوں ورنہ نثر میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں ۔‘‘

اس روز ساری شام ایک پریشانی راشد صاحب پر مسلط رہی اور وہ تھی ساقی فاروقی سے ان کی ملاقات کا وعدہ ۔ لندن پہنچنے سے پہلے وہ ٹیلی فون پر ساقی فاروقی سے ملاقات کا وعدہ کر چکے تھے ۔ چنانچہ اب ہم سڑک پر چلتے چلتے جہاں بھی ٹیلی فون بُوتھ نظر آتا رک جاتے اور ساقی فاروقی کا

نمبر گھمایا جاتا - آخری کال پیڈنگٹن اسٹیشن سے کی گئی - میں نے پوچھا "راشد صاحب پریشانی کیا ہے -"

"یار پریشانی یہ ہے کہ ساقی دفتر سے چل چکا ہے اور گھر ابھی تک نہیں پہنچا -"

"تو پھر کیا ہوا ، لندن میں بالغوں کے اغوا کے واقعات ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتے -"

"نہیں ، بات یہ ہے کہ وہ کار بہت خراب چلاتا ہے - کبھی ٹکر مار دیتا ہے اور کبھی ون وے اسٹریٹ میں گھس کر چالان کروا بیٹھتا ہے - اس کے دفتر والے کہتے ہیں کہ وہ گھر جا چکا ہے اور بیوی کہتی ہے کہ گھر نہیں پہنچا -"

اب پیڈنگٹن اسٹیشن پر ایک نشست ہوئی - نشست ان معنوں میں کہ ہم چلتے چلتے اور ساقی کو ٹیلی فون کرتے کرتے اب تھک گئے تھے - اسٹیشن پر سر شام مضافات کی گاڑیاں پکڑنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا - شور میں اضافہ ہو رہا تھا - اسٹیشن کے چاء گھر میں مسافر چاء کی پیالیاں جلدی جلدی پی رہے تھے مگر ہم اطمینان سے بیٹھے تھے کہ راشد صاحب کی گاڑی روانہ ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا -

وہ جب سے آئے تھے ان کی بغل میں ایک بڑا سا لفافہ تھا جسے انہوں نے اطالوی قہوہ خانے میں اپنی برساتی کے اوپر اور ہیٹ کے نیچے رکھا تھا کہ کہیں بھول نہ جائیں - اس وقت وہی لفافہ ان کے ہاتھ میں تھا - مجھ سے پوچھا "کیا یہ لفافہ تم اپنے بریف کیس میں پاکستان لے جاسکو گے ؟"

"ضرور لے جاؤں گا مگر اس میں ہے کیا ؟"

"یہ میرا نیا مجموعہ ہے -"

میں نے خاکی رنگ کا لفافہ ، جسے ابھی سر بمہر نہیں کیا گیا تھا ، ان کے ہاتھ سے لے لیا - اندر ایک فائیل میں صاف ستھرے کاغذوں پر ان کے مجموعے کا صفائی سے ٹائپ کیا ہوا مسودہ تھا - کہیں کہیں ہاتھ سے تصحیح بھی کی گئی تھی -

پھر اس کے چھپوانے کے انتظامات پر گفتگو ہونے لگی - وہ کتاب کے

حسنِ طباعت اور صحتِ املا پر بہت توجہ دیتے تھے ۔ فیصلہ یہ ہوا کہ وہ پروف خود پڑھیں گے ۔ میں ہفتہ وار کتابت شدہ کاپی رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے انھیں انگلستان بھجواؤں گا اور وہ پروف پڑھ کر کاپی فوراً واپس بھیجا کریں گے ۔ اس طرح منزل بمنزل کتاب چھپ جائے گی ۔ کتاب کا سائز کیا ہوگا ؟ نظموں میں جہاں جہاں خطوطِ وحدانی آتے ہیں وہ کس طرح ٹائپ ہوں گے ؟ گردپوش کیسا ہوگا ؟ سرورق کے آخری صفحے کا کیا مصرف ہوگا ؟ غرض یہ کہ طباعت کی تمام تفصیلات پر گفتگو ہوئی ۔ پھر میں نے کہا ''اب مجھے اس مجموعے کی کوئی نظم سنائیے ۔'' انھوں نے کہا ''تم ساتھ لیے جا رہے ہو ، راستے میں پڑھ لینا ۔" مگر میں نے اصرار کیا کہ آپ کی زبانی سنوں گا ۔ اور دل میں سوچنے لگا کہ دیکھوں راشد اپنی کون سی نظم کا انتخاب کرتے ہیں ۔ انھوں نے مسودے کو ادھر اُدھر سے پلٹ کر ''حسن کوزہ گر'' کا آخری حصہ اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر سنایا ۔ اب اس نظم کو پڑھتا ہوں اور اس آخری ملاقات کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یہ بات بھی واضح ہونے لگتی ہے کہ انھوں نے اس نظم کا انتخاب کیوں کیا ہوگا اور پھر یہ کہ کتاب کی ترتیب میں اسے سب سے آخر میں کیوں رکھا ۔

نظم کے بعد ہم اس کے سیاق و سباق اور تمثیلات پر گفتگو کرنے لگے اور میں نے پوچھا "راشد صاحب یہ بتائیے کہ آپ نے تخلیقی عمل کے لیے شاعر کی بجائے کوزہ گر کا سمبل کیوں انتخاب کیا اور پھر یہ کہ اس نظم کی جہاں زاد ایک علامت کے ماورا کون شخصیت ہے ؟" اس کے جواب میں راشد صاحب نے ایک طویل اور دل چسپ ذاتی داستان سنائی ۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو شاید میں یہ داستان قلم بند کر ڈالتا لیکن اب نہیں ۔ ان کی زندگی میں ان کے ناراض ہو جانے کی صورت میں معافی مانگی جا سکتی تھی مگر اب نہیں ۔

ان کے بڑے صاحب زادے شہریار راشد ابھی چند ہفتے ہوئے مجھ سے ملنے آئے تھے ۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ انتقال سے چند ماہ پہلے جب راشد ان سے برسلز میں ملنے آئے تو بیٹے سے کہا کہ میں اپنے کلام کا مجموعہ مرتّب کر رہا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری مجموعہ ہوگا ۔ بیٹے نے پوچھا "کیوں'' تو انھوں نے کہا "ایک تو میں بڑے بوڑھوں کی

طرح اپنے وقت کے بعد جینا نہیں چاہتا ۔ دوسرے بعض شاعروں کی طرح اپنے آپ کو دہرانا نہیں چاہتا ۔''

میں لندن سے یہ مجموعہ اپنے ساتھ لاہور لے آیا ۔ ابھی واپس آئے چند روز ہوئے تھے کہ صلاح الدین محمود اور زاہد ڈار مجھ سے ملنے کے لیے آئے ۔ میں نے ان کی تشویق کے لیے اس میں سے چند نظمیں انھیں سنائیں ۔ صلاح الدین محمود ''نیا ادارہ'' کے ذریعے خود اپنی نگرانی میں مجموعہ چھپوانے پر تیار ہوگئے ۔ میں نے مسودہ ان کے حوالے کیا اور راشد صاحب کا پتا ایک پرزے پر لکھ کر انھیں دیا کہ مسودے کی رسید انھیں بھیج دیں ، طباعت کا انتظام شروع کروائیں اور وقتاً فوقتاً ان سے ہدایات بھی لیتے رہیں — مسودہ ان کے سامنے رکھا تھا اور پتا ان کے ہاتھ میں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ کل شام لندن میں راشد صاحب کا انتقال ہوگیا ۔ گفتگو یک لخت ختم ہوگئی ۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ۔ کمرے میں کچھ عرصہ خاموشی رہی ۔ پھر پتا انھوں نے مجھے واپس کر دیا اور مجموعہ میرے اور ان کے لیے مرحوم کی امانت بن گیا اور اس کی طباعت ناخن پر گرۂ نیم باز کا قرض ہوگئی ۔

اعجاز حسین بٹالوی

اکتوبر ، ۱۹۷۶ع

لاہور

شہرِ وجود اور مزار

یہ مزار،
سجدہ گزار جس پہ رہے ہیں ہم
یہ مزارِ تار — خبر نہیں
کسی صبحِ نو کا جلال ہے

کہ ہے رات کوئی دبی ہوئی ؟
کسی آئنے کو سزا ملی ، جو ازل سے
عقدۂ ناکشا کا شکار تھا ؟
کسی قہقہے کا مآل ہے
جو دوامِ ذات کی آرزو میں نزار تھا ؟

یہ مزار خیرہ نگہ سہی ،
یہ مزار مُہر بلب سہی ،
جو نسیمِ خندہ چلے کبھی تو وہ در کھلیں
جو ہزار سال سے بند ہیں
وہ رسالتیں جو اسیر ہیں
یہ نوائے خندہ نما سنیں تو اُبل پڑیں !

اُنھیں کیا کہیں
کہ جو اپنی آنکھ کے سیم و زر
کسی روگ میں ، کسی حادثے میں
گنوا چکے ؟
اُنھیں کیا کہیں
کہ جو اپنے ساتھ کوئی کرن
سحرِ عدم سے نہ لا سکے ؟
مگر ایک وہ

کہ ہزار شمعوں کے سیل میں
کبھی ایک بار جو گم ہوئے
خبر اپنی آپ نہ پا سکے !

کبھی گردِ رہ ، کبھی مہر و مہ پہ سوار تھے
وہ کہانیوں کے جوان —— کیسے گزر گئے !
وہ گزر گئے ہمیں خاکِ بےکسی جان کر
نہ کبھی ہماری صدا سنی ——
وہ صدا کہ جس کی ہر ایک لَے
کبھی شعلہ تھی ، کبھی رنگ تھی
کبھی دل ہوئی ، کبھی جاں بنی !

وہ نمی ، وہ خلوتِ ترش بُو
جو اُجالا ہوتے ہی
قحبہ گاہوں میں آپ پائیں
وہی خامشیٔ دراز مُو ، وہی سائیں سائیں
کہ جو بنک خانوں کے آس پاس
تمام رات ہے رینگتی
وہی اِس مزار کی خامشی
جو ہماری ہست پہ حکمراں
جو ہماری بود پہ خندہ زن !

مگر آرزوئیں ،

وہ سارے عہدِ گزشتہ کے ،

کبھی واردات کے بال و پر

کبھی آنے والے دنوں کا پرتوِ زندہ تر

وہ ہوائیں ہیں کہ سدا سے

آگ کے رقصِ وحشی و بے زمام میں ہانپتی

کبھی گھر کے سارے شگاف و درز میں چیختی

کبھی چیختی ہیں پلک لگے

کبھی چیختی ہیں سحر گئے !

ابھی سامنے ہے وہ ثانیہ

جسے میرے خوابوں نے

شب کے ناخنِ تیز تر سے بچا لیا

اِسی ثانیے میں وہ شیشۂ پیکر و جاں کے

پھر سے سمیٹ لوں

جو اِنھی ہواؤں کے زور سے

گرے اور ٹوٹ کے ماہ و سال کے رہ گزر

میں بکھر گئے

کہ نہیں ہیں اپنی بہا میں دیدۂ تر سے کم

جو مدار ، حدِّ نظر سے کم !

میں ہوں آرزو کا ـــ
آمید بن کے جو دشت و در میں
بھٹک گئی ـــ
میں ہوں تشنگی کا ـــ
جو کنارِ آب کا خواب تھی
کہ چھلک گئی ـــ
میں کشادگی کا ـــ
جو تنگ نائے نگاہ و دل میں
اُتر گئی ـــ
میں ہوں یک دلی کا ـــ
جو بستیوں کی چھتوں پہ
دودِ سیاہ بن کے بکھر گئی ـــ
میں ہوں لحنِ آب کا ،
رسمِ باد کا ، وردِ خاک کا نغمہ خواں !

یہ بجا کہ ہست ہزار رنگ سے جلوہ گر
مگر اِک حقیقتِ آخریں
یہی آستانۂ مرگ ہے !
یہ بجا سہی
کبھی مرگ اپنی نفی بھی ہے
[وہی مرگ سال بہ سال آپ نے جی بھی ہے]

وہی ہولِ جاں کی کمی بھی ہے ——
یہی وہ نفی تھی کہ جس کے سائے میں
آپ [میرے مراقبے کی طرح]
برہنہ گزر گئے ——
یہ اسی کمی کی تھی ریل پیل
کہ آپ اپنی گرسنگی کی ندی
کے پار اتر گئے
کبھی آسمان و زمیں پہ [دورِ خزاں میں]
بوئے عبیر و گل کی سخاوتوں کی مثال
آپ بکھر گئے ——
ابھی تک [مرا یہ مشاہدہ ہے]
کہ اِس مزار کے آس پاس
عبیر و گل کی لپٹ سے
زائروں ، رہروؤں کے نصیب
جیسے دمک اٹھے
تو ہزار نام بس ایک نام کی گونج بن کے
جھلک اٹھے
تو تمام چہروں سے ایک آنکھ ——
تمام آنکھوں سے اِک اشارہ ——
تمام برسوں سے ایک لمحہ برس پڑا ——
تو پھر آنے والے ہزار قرنوں کی شاہراہیں

[جو راہ دیکھتے تھک گئی تھیں]
شرار بن کے چمک اٹھیں !

یہ بجا کہ مرگ ہے اک حقیقتِ آخریں
مگر ایک ایسی نگہ بھی ہے
جو کسی کنوئیں میں دبی ہوئی
کسی پیرہ زن [کہ ہے ماتما میں رچی ہوئی]
کی طرح ہمیں
ہے ابد کی ساعتِ ناگزیر سے جھانکتی ——
تو اے زائرو ،
کبھی ناوجود کی چوٹیوں سے اُتر کے تم
اِسی اِک نگاہ میں کود جاؤ
نئی زندگی کا شباب پاؤ
نئے ابر و ماہ کے خواب پاؤ !

نہیں مرگ کو [کہ وہ پاک دامن و نیک ہے]
کسی زمزمے کو فسردہ کرنے سے کیا غرض ؟
وہ تو زندہ لوگوں کے ہم قدم
وہ تو اُن کے ساتھ
شراب و نان کی جستجو میں شریک ہے
وہ نسیم بن کے

گلوں کے بیم و رجا میں
آن کی ہر آرزو میں شریک ہے
وہ ہماری لذتِ عشق میں ،
وہ ہمارے شوقِ وصال میں ،
وہ ہماری ھُو میں شریک ہے
کبھی کھیل کود میں ہوں جو ہم
تو ہمارے ساتھ حریف بن کے ہے کھیلتی
کبھی ہارتی کبھی جیتتی ——
کسی چوک میں کھڑے سوچتے ہوں
کدھر کو جائیں ؟
تو وہ اپنی آنکھیں بچھا کے راہ دکھائے گی ——
جو کتاب خانے میں جا کے کوئی کتاب اٹھائیں
تو وہ پردہ ہائے حروف ہم سے ہٹائے گی ،
وہ ہماری روز کی گفتگو میں شریک ہے !

تو ، مرے وجود کے شہر
مجھ کو جگا بھی دو
مری آرزو کے درخت مجھ کو دکھا بھی دو
وہ گلی گلی جو گرا رہے ہیں دو رویہ
کتنے ہزار سال سے برگ و گل ——
مجھے دیکھنے دو وہی سحر ،

وہی دن کا چہرۂ لازوال ،
وہ دھوپ
جس سے ہماری جلد سیاہ تاب ازل سے ہے -
مجھے اُس جنوں کی رہِ خرام پہ لے چلو
نہیں جس کے ہاتھ میں مُو قلم
نہیں واسطہ جسے رنگ سے
فقط ایک پارۂ سنگ سے
ہے کمالِ نقش گرِ جنوں !

اے مرے وجود کے شہر
مجھ کو جگا بھی دو !
مرے ساتھ ایک ہجوم ہے
میں جہاں ہوں
زائروں کے ہجوم بھی ساتھ ہیں
کہ ہم آج
معنی و حرف کی شبِ وصلِ نو
کی برات ہیں !

آگ کے پاس

پیرِ واماندہ کوئی
کوٹ پہ محنت کی سیاہی کے نشاں
نوجواں بیٹے کی گردن کی چمک دیکھتا ہوں
[اِک رقابت کی سیہ لہر بہت تیز

مرے سینۂ سوزاں سے گزر جاتی ہے]
جس طرح طاق پہ رکھتے ہوئے گلداں کی
مس و سیم کے کاسوں کی چمک !
اور گلو اُلجھے ہوئے تاروں سے بھر جاتا ہے ——

کوئلے آگ میں جلتے ہوئے
کن یادوں کی کس رات میں
جل جاتے ہیں ؟
کیا اُنھی کانوں کی یادوں میں جہاں
سال ہا سال یہ آسودہ رہے ؟
اُنھی بے آب درختوں کے وہ جنگل
جنھیں پیرانہ سری بار ہوئی جاتی تھی ؟
کوئلے لاکھوں برس دُور کے خوابوں میں اُلجھ جاتے ہیں ——

آج شب بھی وہ بڑی دیر سے
گھر لوٹا ہے
اُس کے الفاظ کو
اِن رنگوں سے ، آوازوں سے کیا ربط
جو اِس غم زدہ گھر کے خس و خاشاک میں ہیں ؟
اُس کو اِس میز پہ بکھری ہوئی
خوشبوؤں کے جنگل سے غرض ؟

آج بھی اپنے عقیدے پہ بدستور
بضد قائم ہے !

وہ درختوں کے تنومند تنے
[اپنے آئندہ کے خوابوں میں اسیر]
گرد باد آ ہی گئے
اُن کی رہائی کا وسیلہ بن کر
خود سے مہجوریٔ ناگاہ کا حیلہ بن کر
آئے اور چل بھی دیے
طولِ المناک کی دہلیز پہ
"رخصت" کہہ کر
اور وہ لاکھوں برس سوچ میں
آیندہ کے موہوم میں خوابیدہ رہے !

میرے بیٹے ، تجھے کچھ یاد بھی ہے
میں نے بھی شور مچایا تھا کبھی
خاک کے بگڑے ہوئے چہرے کے خلاف ؟
لحنِ بے رنگ ہوا سن کے
مری جاں بھی پکار اٹھتی تھی ؟
میں کبھی ایک انا اور کبھی دو کا سہارا لیتا
اپنی ساتھی سے میں کہہ اٹھتا کہ "جاگو ، اے جان !

ہر انا تیرہ بیاباں میں
بھٹکتے ہوئے پتّوں کا ہجوم !
میرا ڈر مجھ کو نگل جائے گا ــــ"
میرے کانوں میں مرے کرب کی آواز
پلٹ آتی تھی :
"تجھے بے کار خداؤں پہ یقیں
اب بھی نہیں ؟
اب بھی نہیں ؟"

آج بھی اپنے ہی الحاد کی کرسی میں
پڑا اونگھتا ہوں
نوجواں بیٹے کے الفاظ پہ چونک اٹھتا ہوں :
"تو نے ، بیٹے ،
یہ عجب خواب سنایا ہے مجھے
اپنا یہ خواب کسی اور سے ہرگز نہ کہو !"
کبھی آہستہ سے دروازہ جو کھلتا ہے تو ہنس دیتا ہوں
ــــ یہ بھی اِس رات کی صرصر کی
نئی چال ، نیا دھوکا ہے !
"پھول یا پریاں بنانے کا کوئی نسخہ
مرے پاس نہیں ہے بیٹے
مجھے فرداؤں کے صحرا سے بھی

افسونِ روایت کی لہک آتی ہے ——
آگ میں کوئلے بجھنے کی تمنّا نہ کرو
اِن سے آیندہ کے مٹتے ہوئے آثار
اُبھر آئیں گے
اِن گزرتے ہوئے لمحات کی تنہائی میں ——
کیسا یہ خواب سنایا ہے مجھے تو نے ابھی
نہیں ، ہر ایک سے ،
ہر ایک سے یہ خواب کہو
اِس سے جاگ اُٹھتا ہے
سویا ہوا مجذوب
مری آگ کے پاس
ایسے مجذوب کو اِک خواب بہت
خواب بہت —— خواب بہت ——
ایسے ہر مست کو
اک خواب بہت !

یہ خلا پُر نہ ہوا

ذہن خالی ہے
خلا نور سے ، یا نغمے سے
یا نکہتِ گم راہ سے بھی
پُر نہ ہوا

ذہن خالی ہی رہا
یہ خلا حرفِ تسلّی سے ،
تبسّم سے ،
کسی آہ سے بھی پُر نہ ہوا

اک نفی لرزشِ پیہم میں سہی
جہدِ بے کار کے ماتم میں سہی
ہم جو نارس بھی ہیں ، غم دیدہ بھی ہیں
اِس خلا کو
[اِسی دہلیز پہ سوئے ہوئے
سرمست گدا کے مانند]
کسی مینار کی تصویر سے ،
یا رنگ کی جھنکار سے ،
یا خوابوں کی خوشبوؤں سے
پُر کیوں نہ کریں ؟
کہ اجل ہم سے بہت دُور
بہت دُور رہے ؟

نہیں ، ہم جانتے ہیں
ہم جو نارس بھی ہیں ، غم دیدہ بھی ہیں
جانتے ہیں کہ خلا ہے وہ جسے موت نہیں

کس لیے نور سے ، یا نغمے سے
یا حرفِ تسلی سے اِسے "جسم" بنائیں
اور پھر موت کی وارفتہ پذیرائی کریں ؟
نئے ہنگاموں کی تجلیل کا در باز کریں
صبحِ تکمیل کا آغاز کریں ؟

طلب کے تلے

گُل و یاسمن کل سے نا آشنا ،
کل سے بے اعتنا
گُل و یاسمن اپنے جسموں کی ہیئت میں فرد
مگر —— کل سے نا آشنا ، کل سے بے اعتنا

کسی مرگِ مبرم کا درد
اُن کے دل میں نہیں !

فقط اپنی تاریخ کی بے سروپا طلب کے تلے
ہم دبے ہیں !
ہم اپنے وجودوں کی پنہاں تہیں
کھولتے تک نہیں
آرزو بولتے تک نہیں !
یہ تاریخ میری نہیں اور تیری نہیں
یہ تاریخ ہے ازدحامِ رواں
اُسی ازدحامِ رواں کی یہ تاریخ ہے ،
یہ وہ چیخ ہے
جس کی تکرار اپنے من و تُو میں ہے
وہ تکرار جو اپنی تہذیب کی ھُو میں ہے !

تجھے اِس پہ حیرت نہیں
ہم اِس ازدحامِ رواں کے نشانِ قدم پر چلے جا رہے ہیں
بڑھے جا رہے ہیں
کہ ہم ظلمتِ شب میں تنہا
پڑے رہ نہ جائیں ——
بڑھے جا رہے ہیں ،

نہ جینے کی خاطر
نہ اِس سے فزوں زندہ رہنے کی خاطر
بڑھے جا رہے ہیں ، کسی عیب سے
رہزنِ مرگ سے بچ نکلنے کی خاطر ،
جدائی کی خاطر !
کسی فرد کے خوف سے بڑھ رہے ہیں
جو باطن کے ٹوٹے دریچوں کے پیچھے
شرارت سے ہنستا چلا جا رہا ہے -

ہم جسم

درپیش ہمیں
چشم و لب و گوش
کے پیرائے رہے ہیں

کل رات

جو ہم چاند میں
اِس سبزے پہ
اِن سایوں میں
غزلائے رہے ہیں
کس آس میں
کجلائے رہے ہیں ؟

اِس "میں" کو
جو ہم جسموں میں
محبوس ہے
آزاد کریں ——
کیسے ہم آزاد کریں ؟
کون کرے ؟ —— ہم ؟
ہم جسم ؟
ہم جسم کہ کل رات
اِسی چاند میں
اِس سبزے پہ
اِن سایوں میں
خود اپنے کو
دہرائے رہے ہیں ؟

کچھ روشنیاں
کرتی رہیں ہم سے
وہ سرگوشیاں
جو حرف سے
یا صوت سے
آزاد ہیں
کہہ سکتی ہیں
جو کتنی زبانوں میں
وہی بات ، ہر اِک رات
سدا جسم
جسے سننے کو
گوشائے رہے ہیں ــــ

ہم جسم بھی
کل رات کے
اِک لمحے کو
دل بن کے
اِسی بات سے
پھر سینوں کو
گرمائے رہے ہیں ــــ

اِس "میں" کو
ہم آزاد کریں ؟
رنگ کی ، خوشبوؤں کی
اُس ذات کو
دل بن کے
جسے ہم بھی
ہر اِک رات
عزیزائے رہے ہیں ؟
یا اپنے توہمّات کی
زنجیروں میں
اُلجھائے رہے ہیں
اُس ذات کو
جس ذات کے
ہم سائے رہے ہیں ؟

جہاں ابھی رات ہے —

جہاں ابھی رات ہے ، ہوا کے سوا
کوئی زندہ تر نہیں ہے
ابھی ہوا ساحلوں کے بے تاب ہمہموں سے
گزر کے اپنی طلب کے سونے

چہار راہوں میں رک گئی ہے ——
اگر وہ چاہے ،
تو دودِ ماضی کے بام و دیوار پھاند جائے
[وہ دست و پا کے پرانے زخموں
کی ریزشِ خوں سے
ڈر رہی ہے]
ہوا کشوں کی نگہ سے بچ کر
اگر وہ چاہے ،
غموں کی بے صرفہ کھڑکیوں کے
سیاہ شیشوں کو توڑ ڈالے
دلوں کی افسردہ جلوتوں کا سراغ پا لے
[وہ ناتوانوں کے زورِ بازو کے
رازِ پنہاں سے کانپتی ہے]
اگر وہ چاہے ،
شگافِ در سے
[جو رات بھر سے
ہماری بے التفاتیوں سے
کھلے رہے ہیں]
ہمارے صحنوں کو روند ڈالے
ہمارے صحنوں کے چار گوشوں میں پھیل جائے
[مگر وہ ہر صحن کی اداسی کو بھانپتی ہے]

جہاں ابھی رات ہے ، وہاں ہم ––
وہاں ابھی لوگ
بہتے پانی کو بوڑھے دانتوں سے کاٹتے ہیں
اور ایسے روتے ہیں خواب میں
جیسے ایک بے جان جسد سے لگ کے
وہ سو رہے ہوں !
ہوا کو اِس کی خبر نہیں ہے
ہوا کا اِن ہول کے پلوں پر
گزر نہیں ہے !

جہاں ابھی رات ہے ، وہاں ہم –––
وہاں ابھی لوگ
آرزوؤں کے نردبانوں پہ چل رہے ہیں
قدم قدم پر پھسل رہے ہیں
کہ جیسے صحرا سمندروں میں پھسل رہا ہو !
جہاں ابھی رات ہے
ہوا کے سوا کوئی پردہ در نہیں ہے –––
مگر ہوا جب طلب کی راہوں کو چھوڑ کر پھر
ہمارے دیوار و در پہ جھپٹی
ہمیں پھر اپنی برہنگی کا یقین ہوگا
اور اپنے جسموں کے چاک ہم
رات کی سیاہی میں دیکھتے ہی
بہت ہنسیں گے !

بے سُرا الاپ

وہ صحن جن سے پلٹ گئی تھی
دھنک کی خوشبو
وہاں ابھی تک درخت اپنی برہنگی میں
پکارتے ہیں ——

پکارتے ہیں :

—— "دھنک کی خوشبو

وہ خواب لا دے

کہ جن سے بھر جائیں رات بھر میں

سبو ہمارے" ——

وہ چاند ، کل شب ،

جسے ہم اپنے دلوں کے پیالوں

میں قطرہ قطرہ

انڈیلتے رہ گئے تھے ، اُس کو

ہنسی ہنسی میں

ابھی کوئی شخص ، لمحہ پہلے ،

چڑھا کے پیالہ پٹک گیا ہے ——

یہ دیکھتے ہی

گلی کا مُلا بہت ہی رویا :

"خلا سے کچھ عرش کی خبر بھی ؟"

[نفی میں کیسے نفی کا جویا !]

"وہ چاند کے آرپار —— گویا ——

کہیں نہیں تھا ؟

عجیب ! گویا کہیں نہیں تھا !"

وہ صحن جن سے پلٹ گئی ہے

دھنک کی خوشبو

وہ آن میں فردا کی نارسائی کے اشک
چپ چاپ بو رہا ہے ——
وہ ہنس رہا ہے :
"اگر زمیں گھومتی ہے ، کیونکر
یہ لوگ صحنوں کو لوٹ آئے سحر سے پہلے
کوئی پرندہ نہ راہ بھولا سفر سے پہلے ؟"

وہ صحن جن سے پلٹ گئی تھی
دھنک کی خوشبو
خلا سے آتی ہوئی صدائیں
اب اُن کے دیوار و بام کو
تھپتھپا رہی ہیں ،
ہمارے بوڑھے نزار چہروں پہ لطمہ زن ہیں
کہ رات کے دل فریب رؤیا
ہمارے سینوں میں
بے سُرا سا الاپ بن کر
اٹک گئے ہیں !

طوفان اور کرن

شب تم اِس قلعے کے "ناجشن" میں
موجود نہ تھے
[شاد رہو !]
کیسی طوفان کی شوریدہ سری تھی ، توبہ !

کس طرح پردے کیے چاک
گرائے فانوس
اور ہر درز میں غـرّاتا رہا !
ڈگمگاتے ہوئے مہمان
ضیافت کی صفوں سے گزرے
پاؤں تک رکھتے نہ تھے
دل کے قالینوں کے
رنگ و خط و محراب کو
تکتے بھی نہ تھے !

آ کے ٹھہری ہے لبِ کاسۂ جاں
یاد کے جنگلِ افسردہ سے
بجتی ہوئی اِک تازہ کرن
پر جھپکتی بھی نہیں
اور —— اُس آنکھ کو جو کاسۂ جاں میں
وا ہے
ابھی تکتی بھی نہیں ——
[یہی وہ کاسۂ جاں
جس میں جلائی ہیں گلُوں کی شمعیں ،
جس میں سو رنگ سے کل رات کے مانند
منائی ہیں خدائی راتیں !]

اے کرن ،

شکر کہ ہم

ہجر کے زینوں پہ یا

وصل کے آئینوں پہ

جم جاتے نہیں !

اور —— بے کار ہیولاؤں کے ساتھ

بہتی مالاؤں پہ تھم جاتے نہیں

جن میں نادیدہ ملاقات کی سرگوشی ہو

ایسے گوشوں میں بھی ہم جاتے نہیں !

کل تم اِس قلعے کے ناجشن میں موجود نہ تھے

اور نہ تم سُن ہی سکے

کیسی دوشیزہ وہ دستک تھی

جسے سُن نہ سکے

اُس کے مژگاں کی لب و چشم کی پیہم دستک !

ایسی دوشیزہ

کہ افلاس کے ناشہروں کی رہنے والی

وہ اُترتی ہی گئی

زینوں سے

دیواروں سے

تا حدِ غبار

تم کہ تھے سیر نگاہ اپنے توہّم پہ سوار
اُس کی آواز کہیں سن نہ سکے !

اب بھی وہ قلعۂ عرفاں کے دریچے کے تلے
دیتی رہتی ہے دبی پیاس کی دستک شب و روز !
اے کرن ،
اُس کے لیے قطرۂ اشک !
اپنے نادیدہ اُجالوں کی پھواروں سے
کوئی قطرۂ اشک !
جس سے دھندلائے بدن
پھر سے نکھر کر نکلیں
خندۂ نور سے بھر کر نکلیں !

گزرگاہ

وقت کے پابند ہاتھ
راہوں کا غمگیں جواب
سنتے رہے ،
سبزے کے تشنہ سراب

رات کا دیوانہ خواب
تکتے رہے،
جیسے وہ جاسوس ہوں
جن کا ہدف
آنکھ سے اوجھل کوئی
آفتاب!

وعدے کی سردی کی رات
[وعدے کی بے مہر رات]
کیسی ہوائیں چلیں
دیدہ و دل نے مرے
کیسے طمانچے سہے!
کیسے ہر اک چاپ سے
خون پہ ضربیں پڑیں
کیسے رگیں درد کے
راگ سے بوجھل رہیں!

آہ وہ زیبا کلام
کِھل اٹھیں
جس کے لیے بارہا
روح کی شب ہائے تار

اور پگھلتے رہے
جس کے لیے
ہجر کی برفوں کے خواب
آہ وہ زیبا کلام
دور کا سایہ رہا

اور میں سوچا کیا
جینے کی خاطر مگر
رینگتے سایوں سے وابستہ رہوں ؟
بات کے پُل پر کھڑا
پیاس سے خستہ رہوں ؟

اے سمندر

اے سمندر ،
پیکرِ شب ، جسم ، آوازیں
رگوں میں دوڑتا پھرتا لہو
پتھروں پر سے گزرتے

رقص کی خاطر اذاں دیتے گئے
اور میں ، مرتے درختوں میں نہاں
سنتا رہا ــــ
اِن درختوں میں مرا اِک ہاتھ
عہدِ رفتہ کے سینے پہ ہے
دوسرا ، اِک شہرِ آیندہ میں ہے
جویائے راہ ــــ
شہر ، جس میں آرزو کی مے انڈیلی جائے گی
زندگی سے رنگ کھیلا جائے گا !

اے سمندر ،
آنے والے دن کو یہ تشویش ہے
رات کا کابوس جو دن کے نکلتے ہی
ہوا ہو جائے گا
کون دے گا اُس کے ژولیدہ سوالوں کا جواب ؟
کس کرن کی نوک ؟
کن پھولوں کا خواب ؟

اے سمندر ،
میں گنوں گا
دانہ دانہ تیرے آنسو

جن میں اِک زخّار بے ہستی کا شور !
اے سمندر ،
میں گنوں گا دانہ دانہ تیرے آنسو
جن میں آنے والا جشنِ وصل نا آسودہ ہے
جن میں فردائے عروسی کے لیے
کرنوں کے ہار
شہرِ آیندہ کی روحِ بے زماں
چُنتی رہی ---
میں ہی دوں گا جشن میں دعوت تجھے
استراحت تیری لہروں کے سوا
کس شے میں ہے ؟

رات اِس ساحل پہ غرّاتے رہے
غم زدہ لمحات کے ترسے ہوئے کتّوں کی نظریں
چاند پر پڑتی رہیں
اُن کی عو عو دُور تک لپکی رہی !

اے سمندر ،
آج کیونکر ، ابر کے اوراقِ کہنہ
بازوے دیرینۂ اُمید پر اُڑتے ہوئے
دُور سے لائے نرالی داستاں !

چاند کی ٹوٹی ہوئی کشتی کی باہوں پر رواں !
شہرِ آیندہ کے دست و پا کے رنگ
—— جیسے جاں دینے پہ سب آمادہ ہوں ——
دست و پا میں جاگ اُٹھے
راگ کے مانند ،
میں بھی دست و پا میں جاگ اٹھا !

اے سمندر ،
کل کے جشنِ نو کی موج
شہرِ آیندہ کی بینائی کی حد تک آ گئی ——
اب گھروں سے ،
جن میں راندہ روز و شب کی
چار دیواری نہیں ،
مرد و زن نکلیں گے
ہاتھوں میں اُٹھائے برگ و بار
جن کو چُھو لینے سے لوٹ آئے گی روگرداں بہار !
اے سمندر ——

حسن کوزہ گر

(۲)

اے جہاں زاد،
نشاط اس شبِ بے راہ روی کی
میں کہاں تک بھولوں؟
زورِ مے تھا، کہ مرے ہاتھ کی لرزش تھی

کہ اُس رات کوئی جام گرا ٹوٹ گیا ——
تجھے حیرت نہ ہوئی !
کہ ترے گھر کے دریچوں کے کئی شیشوں پر
اُس سے پہلے کی بھی درزیں تھیں بہت ——
تجھے حیرت نہ ہوئی !
اے جہاں زاد ،
میں کوزوں کی طرف ، اپنے تغاروں کی طرف
اب جو بغداد سے لوٹا ہوں ،
تو میں سوچتا ہوں ——
سوچتا ہوں : تُو مرے سامنے آئینہ رہی
سرِ بازار ، دریچے میں ، سرِ بسترِ سنجاب کبھی
تُو مرے سامنے آئینہ رہی ،
جس میں کچھ بھی نظر آیا نہ مجھے
اپنی ہی صورت کے سوا
اپنی تنہائیِ جانکاہ کی دہشت کے سوا !
لکھ رہا ہوں تجھے خط
اور وہ آئینہ مرے ہاتھ میں ہے
اِس میں کچھ بھی نظر آتا نہیں
اب ایک ہی صورت کے سوا !
لکھ رہا ہوں تجھے خط
اور مجھے لکھنا بھی کہاں آتا ہے ؟

لوحِ آئینہ پہ اشکوں کی پھواروں ہی سے
خط کیوں نہ لکھوں ؟

اے جہاں زاد ،
نشاط اُس شبِ بے راہ روی کی
مجھے پھر لائے گی ؟
وقت کیا چیز ہے تو جانتی ہے ؟
وقت اِک ایسا پتنگا ہے
جو دیواروں پہ ، آئینوں پہ ،
پیمانوں پہ ، شیشوں پہ ،
مرے جام و سبو ، میرے تغاروں پہ
سدا رینگتا ہے
رینگتے وقت کے مانند کبھی
لوٹ کے آئے گا حسن کوزہ گرِ سوختہ جاں بھی شاید !

اب جو لوٹا ہوں ، جہاں زاد ،
تو میں سوچتا ہوں :
شاید اِس جھونپڑے کی چھت پہ یہ مکڑی مری محرومی کی ـــــ
جسے تنتی چلی جاتی ہے ، وہ جالا تو نہیں ہوں میں بھی ؟
یہ سیہ جھونپڑا ' میں جس میں پڑا سوچتا ہوں
میرے افلاس کے روندے ہوئے اجداد کی
بس ایک نشانی ہے یہی

اُن کے فن ، اُن کی معیشت کی کہانی ہے یہی
میں جو لوٹا ہوں تو وہ سوختہ بخت
آ کے مجھے دیکھتی ہے

دیر تک دیکھتی رہ جاتی ہے
میرے اِس جھونپڑے میں کچھ بھی نہیں ——
کھیل اِک سادہ محبت کا
شب و روز کے اِس بڑھتے ہوئے کھوکھلے پن میں جو کبھی
کھیلتے ہیں
کبھی رو لیتے ہیں مل کر ، کبھی گا لیتے ہیں ،
اور مل کر کبھی ہنس لیتے ہیں
دل کے جینے کے بہانے کے سوا اور نہیں ——
حرف سرحد ہیں ، جہاں زاد ، معانی سرحد
عشق سرحد ہے ، جوانی سرحد
اشک سرحد ہیں ، تبسّم کی روانی سرحد
دل کے جینے کے بہانے کے سوا اور نہیں ——
[دردِ محرومی کی ،
تنہائی کی سرحد بھی کہیں ہے کہ نہیں ؟]

میرے اِس جھونپڑے میں
کتنی ہی خوشبوئیں ہیں
جو مرے گرد سدا رینگتی ہیں

اُسی اِک رات کی خوشبو کی طرح رینگتی ہیں ---
در و دیوار سے لپٹی ہوئی اِس گرد کی خوشبو بھی ہے
میرے افلاس کی ، تنہائی کی ،
یادوں کی ، تمنّاؤں کی خوشبوئیں بھی ،
پھر بھی اِس جھونپڑے میں کچھ بھی نہیں ---
یہ مرا جھونپڑا تاریک ہے ، گندہ ہے ، پراگندہ ہے
ہاں ، کبھی دُور درختوں سے پرندوں کی صدا آتی ہے
کبھی انجیروں کے ، زیتونوں کے باغوں کی مہک آتی ہے
تو میں جی اُٹھتا ہوں
تو میں کہتا ہوں کہ لو آج نہا کر نکلا !
ورنہ اِس گھر میں کوئی سیج نہیں ، عطر نہیں ہے ،
کوئی پنکھا بھی نہیں ،
تجھے جس عشق کی خُو ہے
مجھے اُس عشق کا یارا بھی نہیں !

تو ہنسے گی ، اے جہاں زاد ، عجب بات
کہ جذبات کا حاتم بھی میں
اور اشیا کا پرستار بھی میں
اور ثروت جو نہیں اُس کا طلب گار بھی میں !
تو جو ہنستی رہی اُس رات تذبذب پہ مرے
میری دو رنگی پہ پھر سے ہنس دے !

عشق سے کس نے مگر پایا ہے کچھ اپنے سوا ؟
اے جہاں زاد ،
ہے ہر عشق سوال ایسا کہ عاشق کے سوا
اس کا نہیں کوئی جواب
یہی کافی ہے کہ باطن کی صدا گونج اٹھے !

اے جہاں زاد
مرے گوشۂ باطن کی صدا ہی تھی
مرے فن کی ٹھٹھرتی ہوئی صدیوں
کے کنارے گونجی
تیری آنکھوں کے سمندر کا کنارا ہی تھا
صدیوں کا کنارا نکلا
یہ سمندر جو مری ذات کا آئینہ ہے
یہ سمندر جو مرے کوزوں کے بگڑے ہوئے ،
بنتے ہوئے سیماؤں کا آئینہ ہے
یہ سمندر جو ہر اِک فن کا
ہر اِک فن کے پرستار کا
آئینہ ہے

سمندر کی تہ میں

سمندر کی تہ میں
سمندر کی سنگین تہ میں
ہے صندوق ——
صندوق میں ایک ڈبیا میں ڈبیا

میں ڈبیا ——

میں کتنے معانی کی صبحیں ——
وہ صبحیں کہ جن پر رسالت کے در بند
اپنی شعاعوں میں جکڑی ہوئی
کتنی سہمی ہوئی !
[یہ صندوق کیوں کر گرا ؟
نہ جانے کسی نے چرایا ؟
ہمارے ہی ہاتھوں سے پھسلا ؟
پھسل کر گرا ؟
سمندر کی تہ میں —— مگر کب ؟
ہمیشہ سے پہلے
ہمیشہ سے بھی سالہا سال پہلے ؟]
اور اب تک ہے صندوق کے گِرد
لفظوں کی راتوں کا پہرا
—— وہ لفظوں کی راتیں
جو دیووں کے مانند ——
پانی کے لسدار دیووں کے مانند !
یہ لفظوں کی راتیں
سمندر کی تہ میں تو بستی نہیں ہیں
مگر اپنے لاریب پہرے کی خاطر
وہیں رینگتی ہیں

شب و روز

صندوق کے چار سُو رینگتی ہیں
سمندر کی تہ میں !
بہت سوچتا ہوں
کبھی یہ معانی کی پاکیزہ صبحوں کی پریاں
رہائی کی اُمید میں
اپنے غوّاص جادوگروں کی
صدائیں سنیں گی ؟

سفر نامہ

آسے ضد کہ نور کے ناشتے میں
شریک ہوں !
ہمیں خوف تھا سحرِ ازل
کہ وہ خود پرست نہ روک لے

ہمیں اپنی راہِ دراز سے
کہیں کامرانیٔ نو کے عیش و سرور میں
ہمیں روک لے
نہ خلا کے پہلے جہاز سے
جو زمیں کی سمت رحیل تھا!

ہمیں یہ خبر تھی بیان و حرف کی خُو اسے
ہمیں یہ خبر تھی کہ اپنی صوتِ گلو اسے
ہے ہر ایک شے سے عزیز تر
ہمیں اور کتنے ہی کام تھے [تمھیں یاد ہے ؟]
ابھی پاسپورٹ لیے نہ تھے
ابھی ریزگاری کا انتظار تھا
سوٹ کیس بھی ہم نے بند کیے نہ تھے
اسے ضد کہ نور کے ناشتے میں شریک ہوں!

وہ تمام ناشتہ
اپنے آپ کی گفتگو میں لگا رہا:
"ہے مجھے زمیں کے لیے خلیفہ کی جستجو
کوئی نیک خو
جو مرا ہی عکس ہو ہوبہو!"
تو امیدواروں کے نام ہم نے لکھا دیے
اور اپنا نام بھی ساتھ اُن کے بڑھا دیا!

"مری آرزو ہے شجر حجر
مری راہ میں شب و روز
سجدہ گزار ہوں ــــ
مری آرزو ہے کہ خشک و تر
مری آرزو میں نزار ہوں ــــ
مری آرزو ہے کہ خیر و شر
مرے آستاں پہ نثار ہوں ــــ
مری آرزو ــــ مری آرزو ــــ"
شجر و حجر تھے نہ خشک و تر
نہ ہمیں تھی مستیٔ خیر و شر
ہمیں کیا خبر ؟
تو تمام ناشتہ چُپ رہے
وہ جو گفتگو کا دھنی تھا
آپ ہی گفتگو میں لگا رہا !

بڑی بھاگ دوڑ میں
ہم جہاز پکڑ سکے
اِسی انتشار میں کتنی چیزیں
ہماری عرش پہ رہ گئیں
وہ تمام عشق ــــ وہ حوصلے
وہ مسرّتیں ــــ وہ تمام خواب
جو سوٹ کیسوں میں بند تھے

"آپ" کے چہرے

"آپ" ہم جس کے قصیدہ خواں ہیں
وصلِ البتہ و لیکن کے سوا
اور نہیں
"آپ" ہم مرثیہ خواں ہیں جس کے

ہجرِ البتّہ و لیکن کے سوا
اور نہیں
"آپ" دو چہروں کی ناگن کے سوا اور نہیں !

روز "البتّہ" مرے ساتھ
پرندوں کی سحر جاگتے ارمانوں
کے بستر سے اُٹھا
سیر کی ، غسل کیا
اور مرے ساتھ ہی صبحانہ کیا ،
بے سُرے گیت بھی گائے ——
یونہی "لیکن" بھی مرے ساتھ
کسی بوڑھے جہاں گرد کے مانند
لڑھکتا رہا ، لنگڑاتا رہا ——
شام ہوتے ہی وہ اُن خوف کے پُتلوں کی طرح
جو زمانے سے ، کسی شہر میں مدفون چلے آتے ہوں
ناگہاں نیندوں کی الماری میں پھر ڈھیر ہوئے
اُن کے خرّاٹوں نے شب بھی مجھے سونے نہ دیا ——
"آپ" البتّہ و لیکن کے سوا اور نہیں !

بارہا ایک ہی وہ چہرہ —— وہ "البتّہ"
جسے جانتے ہو
دن کی بیہودہ تگ و تاز میں ،

یا شور کے ہنگامِ مَن و تُوئی میں
نوحہ گر ہوتا ہے "لیکن" پہ کہ موجود نہیں
بارہا ایک ہی وہ چہرہ — وہ "لیکن"
جسے پہچانتے ہو
اپنے سنّاٹے کے بالینوں پر
اپنی تنہائی کے آئینوں میں
آپ ہی جھولتا ہے
قہقہے چیختا ہے
اپنے البتّہ کی حالت پہ کہ موجود نہیں —

آؤ، البتّہ و لیکن کو
کہیں ڈھونڈھ نکالیں پھر سے
اُن کے بستر پہ نئے پھول بچھائیں
جب وہ پھر وصل پہ آمادہ نظر آئیں
تو [ہم آپ] کسی گوشے میں چپ چاپ
سرک جائیں !

مریل گدھے

تلاش — کہنہ ، گرسنہ پیکر
برہنہ ، آوارہ ، رہگزاروں میں پھرنے والی
تلاش — مریل گدھے کے مانند
کس دریچے سے آ لگی ہے ؟

غموں کے برفان میں بھٹک کر
تلاش زخمی ہے
رات کے دل پر آس کی دستک
بہت ہی بے جان پڑ رہی ہے
[گدھے بہت ہیں کہ جن کی آنکھوں
میں برف گالے لرز رہے ہیں]
ہوا کے ہاتھوں میں تازیانہ
تمام عشقوں کو راستے سے
[تلاش کو بھی]
بھگا رہی ہے
[تلاش کو عشق کہہ رہی ہے!]

یہ رات ایسی ہے
حرف جس میں لبوں سے نکلیں
تو برف بن کر،
وہ برف پارے کہ جن کے اندر
ہزار پتھرائی ہجر راتیں،
ہزار پتھرائی ہجر راتوں کے بکھرے پنجر
دبے ہوئے ہوں ـــــ
تلاش کیا کہہ رہی ہے؟
[دیکھو، مری کہانی میں رات کے تین بج چکے ہیں

اگر میں بے وزن ہو چکی ہوں ــــ
اگر میں مریل گدھا ہوں
[مجھ کو معاف کر دو ــــ]
تلاش ہی وہ ازل سے بوڑھا گدھا نہیں ہے
دھکیل کر جس کو برف گالے
گھروں کے دیوار و در کے نیچے
لِٹا رہے ہیں ــــ

گدھے بہت ہیں جہاں میں : [ماضی سے آنے والے
جہاز کا انتظار مثلاً ــــ]
[اور ایسے مثلاً میں ثائے ساکن !]
یہ اجتماعی حکایتیں ، اِیتّیں ، کشاکش ،
یہ داڑھیوں کا ، یہ گیسوؤں کا ہجوم مثلاً ــــ
یہ اُلوؤں کی ، گدھوں کی عفّت پہ نکتہ چینی ــــ
یہ بے سُرے راگ ناقدوں کے ــــ
یہ بے یقینی ــــ
یہ ننگی رانیں ، یہ عشق بازی کی دھوم مثلاً ــــ
تمام مریل گدھے ہیں ــــ
[مریل گدھے نہیں کیا ؟]

دریچہ کھولو
کہ برف کی لَے
نئے توانا گدھوں کی آواز
ساتھ لائے
تمھاری روحوں کے چیتھڑوں کو سفید کردے !

میں کیا کہہ رہا تھا؟

میں تنہائی میں کر رہا تھا
پرندوں سے باتیں ــــ
میں یہ کہہ رہا تھا :
"پرندو ، نئی حمد گاؤ

کہ وہ بول جو اِک زمانے میں
بھونروں کی باہوں پہ اُڑتے ہوئے
باغ کے آخری موسموں تک پہنچتے تھے
اب راستوں میں جھلسنے لگے ہیں
نئی حمد گاؤ !"
پرندے ، لگاتار ، لیکن ـــ
پرندے ہمیشہ سے اپنے ہی عاشق ـــ
سراسر وہی آسماں چیختے تھے !

میں یہ کہہ رہا تھا :
"گنہ‌گار دل !
کون جانے کہ کس ہاتھ نے
ہمیں اپنی یادوں کی لمبی قطاروں
کی زنجیر میں
کب سے بے دست و پا کر دیا ہے ؟
وہ ماضی ، کبھی ہانپتے تھے
جو گھوڑوں کے مانند
اب نافراموش‌گاری کے صحنوں میں
لنگڑا رہے ہیں !"

میں یہ کہہ رہا تھا :
"مرے عشق کے سامنے

جنتری کے ورق
اب زیادہ نہ پلٹو
کہ یہ آئنوں کے طلسموں کے مانند
تاریخ کو بارہا رٹ چکی ہے،
مگر دل کا تنہا پیمبر
کبھی اپنی تکرار کا ہمہمہ گائے
ممکن نہیں
کبھی اپنی ہی گونج بن جائے
ممکن نہیں ——
وہی میرے دل کا پیمبر
کہ جس نے دیا ایسا روشن کیا
کہ راتوں کی نیندیں اچٹنے لگیں
وہ خود کو الٹ کر پلٹ کر پرکھنے لگیں ——"

میں یہ کہہ رہا تھا :
"سناتی ہیں جب شہر میں بلّیاں
اپنی جفتی کی معصوم باتیں
تو جنگل کے ہاتھی [مقدّس درختوں
کے ریشوں میں الجھے ہوئے]
کیوں اگلتے ہیں دن رات
آیات کی فربہی

کہ اِن باتیوں کے گنہ گار، معصوم دل
سہم جائیں ؟"

میں یہ کہہ رہا تھا :
"درختو، ہواؤں کو تم کھیل جانو
تو جانو ـــــ
مگر ہم ـــــ نہیں جانتے بوڑھے سبزوں
کی دعوت کو جاتے ہوئے
ذہن کے رہگزاروں میں کیسے
نئے دن کی دُزدیدہ آہٹ کبھی سُن سکیں گے ؟
نہیں صرف پتّھر ہی بے غم ہے پتّھر کی ناتشنگی پر !
درختو، ہوا کتنی تیزی سے گزری
تمھارے برہنہ بدن سے
کہ اِس میں روایات
سرگوشیاں کر رہی تھیں
درختو، بھلا کس لیے نام اپنا
کئی بار دہرا رہے ہو ؟
یہ شیشم، یہ شم شی، یہ شی شی ی ی ی ـــــ
مگر تم کبھی شی ی ی ر ـــــ بھی کہہ سکو گے ؟"
میں یہ کہہ رہا تھا ـــــ

نیا ناچ

میں کھڑا ہوں کئی صدیوں سے
کسی سُوکھے ہوئے خوشۂ گندم کے تلے
[صبح جس کی سرِ آدم سے ہوئی]
اے خدا ، اپنی سیہ آنکھوں کے سیلاب

سے پھر دھو ڈال مجھے

کہ میں پھر آگے بڑھوں ——

اِس سے پہلے کہ ترے گیسوؤں کی تاب

پہ جم جائے اساطیر کی گرد

اِس سے پہلے کہ نگل جائے

تجھے اپنا ہی درد

اے خدا ، پھر سے انڈیل

میرے اِس خالی پیالے میں

گناہوں کی شراب

تاکہ ایمان کے آنکھوں سے نہاں باغوں میں

اُنھی لونگوں کے شگوفوں کا وہ غوغا اُبھرے

اُنھی ریحانوں کی خوشبوؤں کا بلوا پھوٹے

ابتدا جس کی کبھی

بسترِ آدم سے ہوئی !

میں کھڑا ہوں کئی صدیوں سے خدا ،

اور مرے ہاتھوں کی گہرائی سے

پھر مہ و سال کی فریاد سنائی دی ہے

یہی فریاد سنی تھی

کہ اِنھی ہاتھوں کی دارائی سے

میں نے الفاظ کی —— احباب کی ——

اِک بزم سجا ڈالی تھی

جو بہت بڑھتی گئی — بڑھتی گئی —

بڑھتی چلی جائے گی —

کیسی اِک بزم سجا ڈالی تھی !

اے خدا ، تو بھی ذرا

اپنے گل و لا سے اٹے جوتے اُتار

اور اِس بزم میں آ

تا کہ الفاظ — یہ احباب —

جو چوہوں کی طرح ہاتھ نہیں آتے ہیں

پھر ترے پاؤں کی ہر تاپ کے ساتھ

— اپنے مہجور معانی سے بغل گیر

نیا ناچ رچائیں —

نیا ناچ رچائیں !

یارانِ سرِ پُل

انہونیوں کے خواب سے ،
انہونیوں کے مرحلۂ ناب سے ،
جاگے ہوئے کچھ لوگ
اب ہونیوں کے پُل پہ کھڑے کانپتے ہیں ،

کندھوں پہ اُٹھائے ہوئے نعروں کے بیاباں ـــ
اِک گونج ابھی اِن کے تعاقب میں ہے
یہ جس سے ہیں ہردم لرزاں ـــ
[کیا یہ ہے سزا اُن کی
جو زیبائی کو،
یا نور کو،
یا ہست کی دارائی کو
برباد کریں؟]
ہم کیسے سزا یافتہ ہیں!

اِن لوگوں میں اِک میں بھی ہوں
میں اِن کے سوا کچھ بھی نہیں ہوں
ٹوٹے ہوئے اِس پُل سے لگے دوستو
ہم کیسے سزا یافتہ ہیں!

ہاں، آؤ کہ پھر
حافظے کی بجھتے الاؤ میں تلاشیں
وہ زخم کہ جو رِس نہ سکے تھے
پھر پُل کے کٹہرے سے لگے
اپنے گناہوں کی صدائیں ناپیں
دریا کے سیہ جھاگ میں
دیکھی تھیں کبھی تیرتی لاشیں

اب اپنے وجودوں کے حبابوں کو بکھرتا پائیں ــــ
ہم کیسے سزایافتہ ہیں !

اے پُل سے لگے دوستو
تم ہرزہ سرائی کی بلندی سے چھلانگے تھے
مگر حیف ،
کھُل پائے نہ صرصر میں تمھارے چھاتے
[بے چارگیٔ برگ جو آغوشِ ہوا میں رہ جائے !]
اتنا نہ ہوا اپنی خبر ہی لاتے !

ہم چُپ ہیں ، مگر
لفظ ہمیں بول رہے ہیں ــــ
الفاظ یہ کہتے ہیں :
"سرابوں کی تپش پیتے رہے ہو
شبنم کی ہوس جیتے رہے ہو
صحرا ہی کو اب شبنموں کے خواب دکھاؤ !"

مانا کہ کسی نے وہ تنہ پھینکا ہے پُل پر
گُم جس سے ہے آیندہ کا پرتو ہم سے
پھیلے ہوئے لمحوں میں اُلجھ جانے کا ڈر ہے ــــ
[اِک وقت ہے لیکن
جو ابھی زندہ ہے

سایوں کی طرح مردہ نہیں ہے]

ہاں لفظ ہمیں بول رہے ہیں
گزری ہوئی تاریخیں کبھی یاد دلاتے ہیں
کبھی راہ میں ٹھہرے ہوئے
سب نقطے لکیریں
یہ لفظ ہیں ، اُس وقت کے بارے میں یہی جانتے ہیں
جو ایک ہے اور جس کا کوئی نام نہیں ہے !

خورشید کہ نومید تھا
گھر لوٹ گیا تھا
اب اپنے طلوعوں کی ذکاوت کو
[کہ جس سے ہیں سیہ تاب
ہمارے چہرے]
پھر ہم سے چھپا لے ، نہیں
یہ ہو نہیں سکتا !
اے دوستو !
اب آؤ کہ اِس پُل پہ کھڑے
پاؤں میں بے مہری کی زنجیریں
کہیں سخت نہ ہو جائیں !
بس آؤ
کہ پھر شہر کو لوٹیں

کہتے ہیں کہ ہر شعر وہیں نغمہ وہیں ہے
انہونیاں پھر راستہ کاٹیں ، نہیں
یہ ہو نہیں سکتا !

اے شہر ! ہم آئے
فانوسوں کے ، میلوں کے ،
جواں میوہ فروشوں کے
جواں شہر
اے ہست کے صحنوں میں
نئے سجدہ گزاروں کے
جہاں شہر
اے میری اذاں شہر !

مجھے وداع کر

مجھے وداع کر
اے میری ذات ، پھر مجھے وداع کر
وہ لوگ کیا کہیں گے ، میری ذات ،
لوگ جو ہزار سال سے

مرے کلام کو ترس گئے ؟
مجھے وداع کر ،
میں تیرے ساتھ
اپنے آپ کے سیاہ غار میں
بہت پناہ لے چکا
میں اپنے ہاتھ پاؤں
دل کی آگ میں تپا چکا !

مجھے وداع کر
کہ آب و گِل کے آنسوؤں
کی بے صدائی سُن سکوں
حیات و مرگ کا سلامِ روستائی سُن سکوں
میں روز و شب کے دست و پا کی نارسائی سُن سکوں !

مجھے وداع کر
بہت ہی دیر —— دیر جیسی دیر ہوگئی
کہ اب گھڑی میں بیسویں صدی کی رات بج چکی
شجر حجر وہ جانور وہ طائرانِ خستہ پر
ہزار سال سے جو نیچے ہال میں زمین پر
مکالمے میں جمع ہیں
وہ کیا کہیں گے ؟ میں خداؤں کی طرح ——
ازل کے بے وفاؤں کی طرح

پھر اپنے عہدِ ہمدمی سے پھر گیا ؟
مجھے وداع کر ، اے میری ذات

تو اپنے روزنوں کے پاس آ کے دیکھ لے
کہ ذہنِ ناتمام کی مساحتوں میں پھر
ہراس کی خزاں کے برگِ خشک یوں بکھر گئے
کہ جیسے شہرِ ہست میں
یہ نیستی کی گرد کی پکار ہوں ـــــ
لہو کی دلدلوں میں
حادثوں کے زمہریر اتر گئے !
تو اپنے روزنوں کے پاس آ کے دیکھ لے
کہ مشرقی افق پہ، عارفوں کے خواب ـــــ
خوابِ قہوہ رنگ میں ـــــ
امید کا گزر نہیں !
کہ مغربی افق پہ مرگِ رنگ و نور پر
کسی کی آنکھ تر نہیں !

مجھے وداع کر
مگر نہ اپنے زینوں سے اتر
کہ زینے جل رہے ہیں بے ہشی کی آگ میں ـــــ
مجھے وداع کر ، مگر نہ سانس لے
کہ رہبرانِ نو

تری صدا کے سہم سے دبک نہ جائیں
کہ تو صدا رسالتوں کا بار اُن پہ ڈالتی رہی
یہ بار اُن کا ہول ہے!
وہ دیکھ، روشنی کے دوسری طرف
خیال ـــــ کاغذوں کی بالیاں بنے ہوئے
حروف ـــــ بھاگتے ہوئے
تمام اپنے آپ ہی کو چاٹتے ہوئے!
جہاں زمانہ تیز تیز گامزن
وہیں یہ سب زمانہ باز
اپنے کھیل میں مگن
جہاں یہ بام و در لپک رہے ہیں
بارشوں کی سمت،
آرزو کی تشنگی لیے
وہیں گماں کے فاصلے ہیں راہزن!

مجھے وداع کر
کہ شہر کی فصیل کے تمام در ہیں وا ابھی
کہیں وہ لوگ سو نہ جائیں
بوریوں میں ریت کی طرح ـــــ
مجھے، اے میری ذات،
اپنے آپ سے نکل کے جانے دے

کہ اِس زباں بریدہ کی پکار ––– اِس کی ہا و ہو –––
گلی گلی سنائی دے
کہ شہرِ نو کے لوگ جانتے ہیں
[کاسۂ گرسنگی لیے]
کہ اُن کے آب و نان کی جھلک ہے کون ؟
میں اُن کے تشنہ باغچوں میں
اپنے وقت کے دھلائے ہاتھ سے
نئے درخت اُگاؤں گا
میں اُن کے سیم و زر سے ––– اُن کے جسم و جاں سے –––
کولتار کی تہیں ہٹاؤں گا
تمام سنگ پارہ ہائے برف
اُن کے آستاں سے میں اُٹھاؤں گا
اُنھی سے شہرِ نو کے راستے تمام بند ہیں –––

مجھے وداع کر ،
کہ اپنے آپ میں
میں اتنے خواب جی چکا
کہ حوصلہ نہیں
میں اتنی بار اپنے زخم آپ سی چکا
کہ حوصلہ نہیں –––

آ لگی ہے ریت

آ لگی ہے ریت دیواروں کے ساتھ
سارے دروازوں کے ساتھ
سرخ اینٹوں کی چھتوں پر رینگتی ہے
نیلی نیلی کھڑکیوں سے جھانکتی ہے

ریت ـــــ رُک جا

کھیل تو کر لیں

سنہرے تاش کے پتّوں سے

درزوں ، روزنوں کو بند کر لیں

ریت

رک جا !

سست برساتیں کہ جن پر دوڑ پڑنا ،

جن کو دانتوں میں چبا لینا

کوئی مشکل نہ تھا

تو نے وہ ساری نگل ڈالی ہیں رات ـــــ

رات ہم ہنستے رہے ، اے ریت

تو دیوانی بلّی تھی جو اپنی دُم کے پیچھے

گھومتی جاتی تھی

اُس کو چاٹتی جاتی تھی رات !

ریت کی اک عمر ہے اک وقت ہے

لیکن ہمیں

خود سے جدا کرتی چلی جاتی ہے ریت

ناگہاں ہم سب پہ چھا جانے کی خاطر

یہ ہماری موت بن کر تازہ کر دیتی ہے

یادیں دُور کی [یا دیر کی]

ریت کو مٹھی میں لے کر دیکھتے ہیں
اپنی پوروں سے اِسے چھنتے ہوئے
ہم دیکھتے ہیں
اپنے پاؤں میں پھسلتے دیکھتے ہیں
ریت پر چلتے ہوئے
اپنے گیسو اِس سے اٹ جاتے ہیں
بھر جاتے ہیں پیراہن
ہمارے باطنوں کو چیرتی جاتی ہے ریت
پھیلتی جاتی ہے جسم و جاں کے ہر سُو
ہم پہ گھیرا ڈالتی جاتی ہے
ریت !

ریت اِک مثبت نفی تھی
ریت سرحد تھی کبھی
ریت عارف کی اذیّت کا بدل تھی
آنسوؤں کی ، غم کی پہنائی تھی ریت
اپنی جویائی تھی ریت
ریت میں "ہر کس" تھے ہم
دوسرا کوئی نہ تھا
ریت وہ دنیا تھی جس پر
دشمنوں کی مُہر لگ سکتی نہ تھی

اِس کو اپنا تک کوئی سکتا نہ تھا ـــــ
ریت پر ہم سُن رہے ہیں آج
پیرانہ سری کی ، اپنی تنہائی
کی چاپ
دن کے ساحل پر اُتر کر
آنے والی رات کے تودے لگاتی جا رہی ہے
ناگہاں کے بے نہایت کو اُڑا لائی ہے
ریت
دل کے سُونے پن میں در آئی ہے
ریت !

حَسَن کوزہ گر

(۳)

جہاں زاد ،

وہ حلب کی کاروانسرا کا حوض ، رات وہ سکوت
جس میں ایک دوسرے سے ہم کنار تیرتے رہے
محیط جس طرح ہو دائرے کے گرد حلقہ زن

تمام رات تیرتے رہے تھے ہم
ہم ایک دوسرے کے جسم و جاں سے لگ کے
تیرتے رہے تھے ایک شاد کام خوف سے
کہ جیسے پانی آنسوؤں میں تیرتا رہے
ہم ایک دوسرے سے مطمئن زوالِ عمر کے خلاف
تیرتے رہے
تو کہہ اٹھی : "حسن یہاں بھی کھینچ لائی
جاں کی تشنگی تجھے !"
[لو اپنی جاں کی تشنگی کو یاد کر رہا تھا میں
کہ میرا حلق آنسوؤں کی بے بہا سخاوتوں
سے شادکام ہوگیا !]
مگر یہ وہم دل میں تیرنے لگا کہ ہو نہ ہو
مرا بدن کہیں حلب کے حوض ہی میں رہ گیا —
نہیں ، مجھے دوئی کا واہمہ نہیں
کہ اب بھی ربطِ جسم و جاں کا اعتبار ہے مجھے
یہی وہ اعتبار تھا
کہ جس نے مجھ کو آپ میں سمو دیا —
میں سب سے پہلے "آپ" ہوں
اگر ہمیں ہوں — تو ہو اور میں ہوں — پھر بھی میں
ہر ایک شے سے پہلے آپ ہوں !
اگر میں زندہ ہوں تو کیسے "آپ" سے دغا کروں ؟

کہ تیری جیسی عورتیں ، جہاں زاد ،
ایسی اُلجھنیں ہیں
جن کو آج تک کوئی نہیں "سلجھ" سکا
جو میں کہوں کہ میں "سلجھ" سکا تو سربسر
فریب اپنے آپ سے !
کہ عورتوں کی ساخت ہے وہ طنز اپنے آپ پر
جواب جس کا ہم نہیں —

[لبیب کون ہے ؟ تمام رات جس کا ذکر
تیرے لب پہ تھا —
وہ کون تیرے گیسوؤں کو کھینچتا رہا
لبوں کو نوچتا رہا
جو میں کبھی نہ کر سکا
نہیں یہ سچ ہے — میں ہوں یا لبیب ہو
رقیب ہو تو کس لیے تری خودآگہی کی بے ریا نشاطِ ناب کا
جو صد نوا و یک نوا خرامِ صبح کی طرح
لبیب ہر نوائے سازگار کی نفی سہی !]
مگر ہمارا رابطہ وصالِ آب و گل نہیں ، نہ تھا کبھی
وجودِ آدمی سے آب و گل سدا بروں رہے
نہ ہر وصالِ آب و گل سے کوئی جام یا سبو ہی بن سکا
جو اِن کا ایک واہمہ ہی بن سکے تو بن سکے !

جہاں زاد،
ایک تُو اور ایک وہ اور ایک میں
یہ تین زاویے کسی مثلثِ قدیم کے
ہمیشہ گھومتے رہے
کہ جیسے میرا چاک گھومتا رہا
مگر نہ اپنے آپ کا کوئی سراغ پا سکے ــــ
مثلثِ قدیم کو میں توڑ دوں، جو تُو کہے، مگر نہیں
جو سحر مجھ پہ چاک کا وہی ہے اِس مثلثِ قدیم کا
نگاہیں میرے چاک کی جو مجھ کو دیکھتی ہیں
گھومتے ہوئے
سبو و جام پر ترا بدن، ترا ہی رنگ، تیری نازکی
برس پڑی
وہ کیمیا گری ترے جمال کی برس پڑی
میں سیلِ نورِ اندروں سے دُھل گیا!
مرے دروں کی خلق یوں گلی گلی نکل پڑی
کہ جیسے صبح کی اذاں سنائی دی!
تمام کوزے بنتے بنتے "تُو" ہی بن کے رہ گئے
نشاط اِس وصالِ رہگزر کی ناگہاں مجھے نگل گئی ــــ
یہی پیالہ و صراحی و سبو کا مرحلہ ہے وہ
کہ جب خمیرِ آب و گل سے وہ جدا ہوئے
تو اُن کو سمتِ راہِ نو کی کامرانیاں ملیں ــــ

[میں اک غریب کوزہ گر
یہ انتہائے معرفت
یہ ہر پیالہ و صراحی و سبو کی انتہائے معرفت
مجھے ہو اِس کی کیا خبر ؟]

جہاں زاد،
انتظار آج بھی مجھے ہے کیوں وہی مگر
جو نو برس کے دورِ ناسزا میں تھا ؟
اب انتظار آنسوؤں کے دجلہ کا
نہ گمرہی کی رات کا
[شبِ گنہ کی لذتوں کا اِتنا ذکر کر چکا
وہ خود گناہ بن گئیں !]
حلب کی کاروانسرا کے حوض کا، نہ موت کا
نہ اپنی اِس شکست خوردہ ذات کا
اِک انتظارِ بے زماں کا تار ہے بندھا ہوا !
کبھی جو چند ثانیے زمانِ بے زماں میں آ کے رک گئے
تو وقت کا یہ بار میرے سر سے بھی اُتر گیا
تمام رفتہ و گذشتہ صورتوں، تمام حادثوں
کے سُست قافلے
مرے دروں میں جاگ اُٹھے
مرے دروں میں اِک جہانِ بازیافتہ کی ریل پیل جاگ اٹھی

بہشت جیسے جاگ اُٹھے خدا کے لاشعور میں !
میں جاگ اُٹھا غنودگی کی ریت پر پڑا ہوا
غنودگی کی ریت پر پڑے ہوئے وہ کوزے جو
—— مرے وجود سے بروں ——
تمام ریزہ ریزہ ہو کے رہ گئے تھے
میرے اپنے آپ سے فراق میں ،
وہ پھر سے ایک کُل بنے [کسی نوائے سازگار کی طرح]
وہ پھر سے ایک رقصِ بے زماں بنے
وہ رؤیتِ ازل بنے !

اندھا کباڑی

شہر کے گوشوں میں ہیں بکھرے ہوئے
پا شکستہ سر بُریدہ خواب
جن سے شہر والے بے خبر !
گھومتا ہوں شہر کے گوشوں میں روز و شب

کہ اُن کو جمع کرلوں
دل کی بھٹّی میں تپاؤں
جس سے چھُٹ جائے پرانا میل
اُن کے دست و پا پھر سے اُبھر آئیں
چمک اُٹھیں لب و رخسار و گردن
جیسے نوآراستہ دولھوں کے دل کی حسرتیں
پھر سے اِن خوابوں کو سمتِ رہ ملے !

"خواب لے لو خواب ——"
صبح ہوتے چوک میں جاکر لگاتا ہوں صدا ——
"خواب اصلی ہیں کہ نقلی ؟"
یوں پرکھتے ہیں کہ جیسے اُن سے بڑھ کر
خواب داں کوئی نہ ہو !
خواب گر میں بھی نہیں
صورت گرِ ثانی ہوں بس ——
ہاں مگر میری معیشت کا سہارا خواب ہیں !

شام ہو جاتی ہے
میں پھر سے لگاتا ہوں صدا ——
"مفت لے لو مفت، یہ سونے کے خواب ——"
"مفت" سن کر اور ڈر جاتے ہیں لوگ
اور چپکے سے سرک جاتے ہیں لوگ ——

"دیکھنا ، یہ "مفت" کہتا ہے
کوئی دھوکا نہ ہو ؟
ایسا کوئی شعبدہ پنہاں نہ ہو ؟
گھر پہنچ کر ٹوٹ جائیں
یا پگھل جائیں یہ خواب ؟
بھک سے اُڑ جائیں کہیں
یا ہم پہ کوئی سحر کر ڈالیں یہ خواب ـــ
جی نہیں کس کام کے ؟
ایسے کباڑی کے یہ خواب
ایسے نابینا کباڑی کے یہ خواب !"

رات ہو جاتی ہے
خوابوں کے پلندے سر پہ رکھ کر
منہ بسورے لوٹتا ہوں
رات بھر پھر بڑبڑاتا ہوں
"یہ لے لو خواب ـــ
اور لے لو مجھ سے اِن کے دام بھی ـــ
خواب لے لو ، خواب ـــ
میرے خواب ـــ
خواب ـــ میرے خواب ـــ
خوا ا ا ا ب ـــ
اِن کے دا ا ا ا م بھی ی ی ی ـــ"

بات کر

بات کر مجھ سے
مجھے چہرہ دکھا میرا کہ ہے
تیری آنکھوں کی تمازت ہی سے وہ جھلسا ہوا

بات کر مجھ سے
مرے رُخ سے ہٹا پردہ
کہ جس پر ہے ریاکاری کے رنگوں کی دھنک
پھیلی ہوئی
وہ دھنک جو آرزومندی کا آئینہ نہیں
بامدادِ شوق کا زینہ نہیں !

تو نے دیکھا تھا کہ کل مَیں [اِک گداگر]
صبح کی دیوار کے سائے تلے
ٹھٹھرا ہوا پایا گیا ـــــ
تیری آنکھیں ، تیرے لب تکتے رہے
اُن کی گرمی پر یقیں کیسے مجھے آتا کہ میں
اپنے دل کے حادثوں کی تہہ میں تھا
یادوں سے غزلایا ہوا !

بات کر مجھ سے
کہ اب شب کے سحر بننے میں
کوئی فاصلہ باقی نہیں
بات کر مجھ سے کہ تیری بات
خطِّ نسخ ہو بر روئے مرگ
اب اُتر جا چشم و گوش و لب کے پار
اُجڑے شہروں کی گذرگاہوں پہ
آوازوں کی قندیلیں اُتار
راز کی لہریں
اُبھر آئیں قطار اندر قطار !

رات شیطانی گئی

رات شیطانی گئی ---

ہاں مگر تم مجھ کو اُلجھاؤ نہیں

میں نے کچل ڈالے ہیں کتنے خوف

اِن پاکیزہ رانوں کے تلے

[کر رہا ہوں عشق سے دھوئی ہوئی
رانوں کی بات !]
رات شیطانی گئی تو کیا ہوا ؟
لاؤ ، جو کچھ بھی ہے لاؤ
یہ نہ پوچھو
راستہ کے گھونٹ باقی ہے ابھی
آج اپنے مختصر لمحے میں اپنے اُس خدا کو
روبرو لائیں گے ہم
اپنے اِن ہاتھوں سے جو ڈھالا گیا ــــ
آج آمادہ ہیں پی ڈالیں لہو ــــ
اپنا لہو ــــ
تا بکے اپنے لہو کی کم روائی تا بکے ؟
سادگی کو ہم کہیں گے پارسائی تا بکے ؟
دست و لب کی نارسائی تا بکے ؟
لاؤ ، جو کچھ بھی ہے لاؤ
رات شیطانی گئی تو کیا ہوا ؟
صَوت و رنگ و نور کا وہ رجز گاؤ
جو کبھی گاتے تھے تم
رات کے حُجرے سے نکلو
اور اذانوں کی صدا سننے کی فرصت دو ہمیں ــــ
رات کے اِس آخری قطرے سے جو اُبھری ہیں
آن بپھری اذانوں کی صدا ــــ
رات ــــ شیطانی گئی تو کیا ہوا ؟

نئے گناہوں کے خوشے

ندی کنارے درخت
بلّور بن چکے ہیں
درخت ، جن کی طناب شاخوں
پہ مرگِ ناگاہ کی صدا

رینگتی رہی تھی

درخت بلّور کی صلیبیں
لہو میں لتھڑے ہوئے زمانوں
میں گڑ گئی ہیں!
ہوا جو فرماں کی پیروی میں
کبھی اِنھیں گدگدانے آئے
یہ اپنی افسوں زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں
مگر ہوا کے لیے کبھی سر نہیں جھکاتے!

کہو، یہ سچ ہے
کہ اب بھی بارش میں اِن کے آنسو
سکوت بن کر پکارتے ہیں؟
نکلتے سورج کو دیکھتے ہی
یہ ستر اپنا، عیوب اپنے سنوارتے ہیں؟
نہیں ــــ
روایت کی لوریوں نے
کلام کی روشنی کو اِن پر
سلا دیا ہے!

کہو، یہ سچ ہے
کہ اِن کی آنکھوں
کی بجلیاں اب بھی گھومتی ہیں؟

غروب ہوتے اُفق کے شہروں کے بام و در کو
سراب ہونٹوں سے چومتی ہیں ؟
نہیں ——
کہ الہام کی سخاوت کے ہاتھ
اِن تک رسا نہیں ہیں !

کہو ، یہ سچ ہے
ابھی پرندے رسول بن کر
دلوں پر اِن کے
اک آنے والے وصال کے خواب آتارتے ہیں ؟
خیال جو دُور دُور سے وہ سمیٹ لائے
تمام اِن پر نثارتے ہیں ؟
نہیں ——
پرندوں کے —— اِن رسولوں کے ——
خواب اپنے ،
خیال اپنے ،
غضب کے ٹھنڈے الاؤ میں جان
دے چکے ہیں !

تو شاید ایسا بھی ہو کسی دن ——
کہ ہر نئے راہرو سے پہلے
نئی طلب کے فشار اِن کے

سمور جسموں کو چاک کردیں !
تو شاید ایسا بھی ہو کسی دن ـــــ
نئے گناہوں کے تازہ خوشوں
سے کھیتیوں کے مشام بھردیں
وہ خوشے جن سے تمام چہرے
طلوع ہوتے ہیں ہر تہجّد کی لَو سے پہلے
وہ خوشے جن سے تمام بوسے
نسیم کی دلنوازیٔ تَو بتَو سے پہلے !

کلام ہنس نہیں رہا

کلام ہنس نہیں رہا

کلام کس طرح ہنسے ؟

ہمارے اِن پٹے ہوئے لطیفوں پر جو ہم اِسے

سنا چکے ہیں بارہا

کلام کس طرح ہنسے ؟
کلام اب پگھل رہا ہے رفتہ رفتہ
آن دلوں کی شمع کی طرح
جو جل چکے ، جلا چکے ——

کلام جس کا ذکر کر رہے ہیں ہم
عجیب بات ہے کلام بھی نہیں !
مگر اِسے کلام کے سوا کہیں تو کیا کہیں ؟
کہ اِس کا اور کوئی نام بھی نہیں !
ہم اِس پہ کچھ فدا نہیں مگر اِسے
جو رد کریں تو کیوں کریں ؟
کہ یہ ہمارے جسم و جاں کو پالتا رہا
ہمارے ذہن و دل کو سالہا سے ڈھالتا رہا ——
یہ اب بھی ڈھالتا ہے اور ڈھالتا رہے گا
اور ہم یہ چاہتے بھی ہیں !

کلام ایک قرب ہے ،
ہمیشہ بُعد کو پکارتا رہا ——
سمندروں کو دیکھتے ہو تم
وہ کس طرح سمندروں کے بُعد کو پکارتے ہیں رات دن ؟
اسی لیے صدائے مرگ
سُن کے اپنے باطنِ نحیف میں

ہم آپ کر اُٹھے ہیں پھر سے ہستِ نو کی آرزو ــــ

وہ رات جو کبھی سیاہ جنگلوں کو ــــ
جنگلوں کی آنکھ سے چھپی ہوئی
مہورتوں کو چاٹتی رہی
وہ اب دلوں کو چاٹتی ہے ، اُن دلوں
کو جن میں پھر سے جاگ اُٹھی
حیاتِ نو کی آرزو ــــ
وہ رات جس کے چاوشوں نے دیکھ پائے
وحشیٔ قدیم کے نشانِ پا
جو شرق و غرب میں نکل پڑا ہے
چور کی دلاوری لیے ــــ
ہم اپنے ماضیٔ قریب کو مٹا تو دیں
ــــ مٹانا چاہتے بھی ہیں مگر ــــ
یہ دیکھتے ہو تم
خفیف سی صدا اُٹھی ، وہ ہانپنے لگا
وہ خوف ہانکنے لگا
وہ اپنے ناخنوں کے جنگلوں سے
ہم کو جھانکنے لگا ؟

وہ رات جو سیاہ جنگلوں کو چاٹتی رہی
وہ آج ہم پہ ایسے آئی ہے کہ جیسے آئے رات

کمسنوں پہ جو کسی بڑے فرج میں ناگہاں
اسیر ہو کے رہ گئے !
ہم آدمی کو پھر سے زندہ کر سکیں گے کیا ؟
—— مگر وہ مرحلے
فسانہ و فسوں کے صد ہزار مرحلے
جو راہ میں پھر آئیں گے ؟

تباہی ! یہ بتا کہ اور مرحلہ بھی ہے
کہ جس کو پار کر سکے گا آدمی ؟
وہ دیکھ وحشیٔ قدیم جو لہو سے
سوچتا رہا سدا
پھر آج رنگ و نور سے اُلجھ پڑا ——
اُسی کا نغمہ ہے
جو سن رہے ہیں ریڈیو سے ہم
دھرم دھما دھما دھرم دھما دھرم ——
بتا وہ راستہ کہاں ہے جس سے پھر
جنوں کے خواب ،
یا خرد کے خواب ،
یا سکوں کے خواب
لوٹ آئیں گے
بتا وہ راستہ کہاں ؟

نیا آدمی

نوا اور سازِ طرب ــــ

یہ سازِ طرب میں نوائے تمنّا

نوائے تمنّا پہ کوچے کے لڑکوں کے پتّھر

یہ پتّھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سرور

نئی آگ ، دل

دلِ ناتواں کی نئی آگ سب کا سرور
نئی آگ سب سے مقدّس ہمیں
ہم اِس آگ کو کس کی آنکھوں کے معبد
پہ جا کر چڑھائیں ؟
نئی آگ کے کس کو معنی سُجھائیں ؟
نئی آگ ہر چشم و لب کا سرور
نئی آگ سب کا سرور

روایت ، جنازہ

خدا اپنے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا
نالہ کرتا ہوا
جنازے کے ہمراہ چلتے ہوئے
گھر کے بے کار لوگوں کا شور و شغب
ریاکار لوگوں کو شور و شغب کا سرور

نئے آدمی کا نزول

اور اُس پر غضب کا سرور
نئے آدمی کی اِس آمد سے پہلے
مہینوں کے بھوکے کئی بھیڑیوں کی فغاں
[زمانے کی بارش میں بھیگے ہوئے بھیڑیے !]
نئے لفظ و معنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی

اور اس پر پرانے نئے بھیڑیوں کی فغاں
فغاں کا غضب اور غضب کا سرور

نئے آدمی کا ادب
ادب اور نیا آدمی
نئے آدمی کو طلب کا سرور
نئے آدمی کے گماں بھی یقیں
گماں جن کا پایاں نہیں ——
گمانوں میں دانش
برہنہ درختوں میں بادِ نسیم
برہنہ درختوں کے دل چیرتی ——
نئے آدمی کا ادب
اور نئے آدمی کو ادب کا سرور

پانی کی آواز

صدائے پائے آب سُن کے آج میں
ادب سے اُٹھ کھڑا ہوا
"سلام ، اے حضور ، آپ آگئے کرم کیا ——
کہ آپ حُسن سے لدی ہوئی

شریر عورتوں سے بھی زیادہ
قابلِ وصال ہیں!
ہم آپ ہی کے انتظار میں
سحر کے گرد
دوپہر کے آس پاس
مردہ رات کے نواح میں
ہمیشہ گھومتے رہے ——
ہم اپنے اونٹ رنگ باغچوں کی
جھاڑیوں کو چھانتے رہے
کہ آپ اُن میں چھپ گئے نہ ہوں کہیں ——
ہمیں یہی گمان تھا ——
مگر کوئی بھی اپنے خواب آپ انتخاب کر نہیں سکا
اِسی طرح یہ آپ کا ورودِ ناگہاں بھی ہے ——
سمندروں میں بھی آپ ہیں
بھاپ میں بھی آپ ہیں
کنوؤں میں بھی ہیں، مسجدوں
کی موئے زیرِ ناف سے اٹی ہوئی
شریف نالیوں میں بھی
تو آپ ہی کا راج ہے،
لہو میں بھی، شراب میں بھی آپ ہیں،
ہزار بار آنسوؤں کی دل‌نوازیوں میں بھی

دکھائی دی ہے
آپ کی جھلک ہمیں !
مگر یہ سچ ہے اِس طرح مصاحبہ نہیں ہوا
نہ آپ آئے اس فسوں گری کے جاں ربا شکوہ سے ،
نہ اس ادائے لحن سے ، نہ اِس حشم سے
آپ نے کبھی کرم کیا !

نہ جب تک آپ آئے تھے
درخت ، جن کی سرنوشت
سرکشی سوا نہیں
یہ سرنوشت بھول کر
جڑوں سے بھی کنارہ گیر ہو گئے ——
گھروں کے صحن صحن میں
سلگتے ایندھنوں پر اولیا کے استخواں
کا درد رنگ ناچنے لگا
قدم قدم پہ مرگھٹوں کی رات کا ضمیر
کانپنے لگا ——

اب آپ کے نزول سے
بس اتنا ہو
یہ ترشرو و تندخو ، یہ خشک سایے
اپنا آپ طنز بن کے راہ لیں ——

مگر نہ ہو،
ہمارے بام و در پلوں کو پھاند جائیں،
گھروں کی میز کرسیاں
چھتوں پہ تیرنے لگیں،
ہمارے کمسنوں کے پیرہن
اُفق کی چوٹیوں سے جا لگیں،
کریم عورتوں کے دست و رُو
کرم کے سیلِ بے حساب میں غروب ہوں
ہماری سادہ الفتوں کے روز و شب
خدا کے لاشعور میں دبے رہیں
یہ مرگ آزما درخت، جانور، یہ رہگزر
پیمبروں کے واہمے کی کیمیاگری بنیں،
یہ کم نمود آدمی
وجودِ بے ثبات کی نفی بنیں!

شہر میں صبح

مجھے فجر آئی ہے شہر میں
مگر آج شہر خموش ہے !
کوئی شہر ہے ،
کسی ریگ زار سے جیسے اپنا وصال ہو !

نہ صدائے سگ ہے نہ پائے دزد کی چاپ ہے
نہ عصائے ہمّتِ پاسباں
نہ اذانِ فجر سنائی دے ——

اب وجد کی یاد ، صلائے شہر ،
نوائے دل
مرے ہم رکاب ہزار ایسی بلائیں ہیں !
[اے تمام لوگو !
کہ میں جنھیں کبھی جانتا تھا
کہاں ہو تم ؟
تمھیں رات سُونگھ گئی ہے کیا
کہ ہو دور قیدِ غنیم میں ؟
جو نہیں ہیں قیدِ غنیم میں
وہ پکار دیں !]

اِسی اِک خرابے کے سامنے
میں یہ بارِ دوش اُتار دوں
مجھے سنگ و خشت بتا رہے ہیں کہ کیا ہوا
مجھے گرد و خاک سنا رہے ہیں وہ داستاں
جو زوالِ جاں کا فسانہ ہے
ابھی بوئے خوں ہے نسیم میں ——
تمھیں آن بھر میں خدا کی چیخ نے آ لیا

—— وہ خدا کی چیخ
جو ہر صدا سے ہے زندہ تر !

کہیں گونج کوئی سنائی دے
کوئی بھولی بھٹکی فغاں ملے ،
میں پہنچ گیا ہوں تمھارے بسترِ خواب تک
کہ یہیں سے گم شدہ راستوں کا نشاں ملے !

زنجبیل کے آدمی

مجھے اپنے آپ سے آ رہی ہے لہو کی بو
کبھی ذبح خانے کی تیز بو
کبھی عورتوں کی اُبلتی لاشوں کی تیز بو
کبھی مرگھٹوں میں کباب ہوتے ہوئے سروں کی

دبیز بو

وہ دبیز ایسی کہ آپ چاہیں تو
تیغِ تیز سے کاٹ دیں
مجھے اپنے آپ سے آ رہی ہے لہو کی بو ،
کہ مجھی کو قتل کیا ہو جیسے کسی نے
شہر کے چوک میں !

یہی چوک تھا ــــ
یہی وہ مقام تھا ، ناگہاں
کسی خوف سے میں جسد سے اپنے لپٹ گیا
[کہیں تھا بھی میرا جسد مگر ؟]
مرے آنسوؤں کی لڑی زمیں پہ بکھر گئی
مری "ہیک ہیک" نہ تھم سکی ــــ
کبھی سائے آ کے سکڑ گئے
کبھی اور بڑھتے چلے گئے
کہ وہ اپنے جبر کے محوروں کے سوا نہ تھے
کسی اور راہ سے باخبر !
مری سسکیاں کسی بے صدائی کے ناگہاں میں
اتر گئیں ــــ

ابھی چاند دفن تھا بادلوں کے مزار میں
وہیں میں نے نفسِ فریب کار کا سر ، بدن

سے اُڑا دیا

وہیں میں نے اپنی خودی کی پیرہ زنِ خمیدہ کمر

کی جان دبوچ لی ––

وہ کوئی برہنہ و مرگ رنگ صدا تھی

جس کا سُراغ پا کے میں چل پڑا ––

وہ صدا جو مسخرہ پن میں مجھ سے کبیر تر

وہ صدا جو مجھ سے شریر تر

کسی فلسفے میں رچی ہوئی وہ چڑیل ––

احمق و تند خو ––

نئے ریگ زاروں میں، فاتحوں کے جہانِ پیر میں

گھومتی ہوئی سو بہ سو

نئے استخوانوں کے آستانوں کی راہ جو ––

[سُرینوں کو ڈھانپو کہ اِن پر ابھی زندگی کی لکد کوب کے اُن ہزاروں برس کے نشاں ہیں، جو گذرے نہیں ہیں، کہ ننگے سُرینوں کی دعوت سے پڑتے رہے ہیں ہمیشہ سے اُن پر روایات کے بعد کے تازیانے اور اُن کے سوا اُن جواں تر نکیلے دماغوں کی کرنوں کے نیزے، جو معقول و منقول دونوں سے خود کو الگ کر چکے ہیں؛ سُرینوں کو ڈھانپو کہ اب تک وہ کودن بھی موجود ہیں جن کا ایماں ہے غوغا و کشتار و امرد پرستی سے وہ بادشاہت ملے گی کہ جس کو وہ برباد کرنے میں مختار

ہوں گے ؛ یہ وہ لوگ ہیں جن کی جنّت کے اُلٹے چھپر کھٹ
میں کابوس کی مکڑیاں اُن کی محرومیاں بُن رہی ہیں ، وہ جنّت
کہ جس میں کسالت کے دن رات نعروں کی رونق سے زندہ
رہیں گے ---]

کئی بار میں نے ---- نکل کے چوک سے ---- سعی کی
کہ میں اپنی بھوتوں کی میلی وردی اُتار دوں
نئے بولتے ہوئے آدمی کے نئے الم میں شریک ہوں
میں اُسی کے حسن میں ، اُس کے فن میں ، اُسی کے دم میں
شریک ہوں
میں اُسی کے خوابوں ، اُنھی کے معنیٔ تہ بہ تہ میں
اُنھی کے بڑھتے ہوئے کرم میں شریک ہوں ----
وہ تمام چوہے ---- وہ شاہ دولا کے ارجمند ----
ہر ایک بار اُچھل پڑے ---- مرے خوف سے
مرے جسم و جاں پہ اُبل پڑے !

تو عجیب بات ہے ، میں اگر
ہمہ تن نشاطِ غرور ہوں ؟
شبِ انتقام کی آگ میں ہوں جلا ہوا ؟
کہ فنا پرست کدورتوں میں رچا ہوا ؟
سنو ! جنگ جُوؤ ، سپاہیو
مری آرزو کی شرافتوں کو دغا نہ دو

میں لُڑھک کے دامنِ کوہ تک جو پہنچ گیا
تو یہ ڈر ہے —
زندہ چبا نہ لوں میں تمھیں — کہ تم
ہو تمام "شیرۂ زنجبیل کے آدمی" !
مری بے بسی پہ ہنسو گے تم تو ہنسا کرو —
میں دعا کروں گا :
خدائے رنگ و صدا و نور
تو اِن کے حال پہ رحم کر !
[خدا ،
رنگِ نو ، نور و آوازِ نو کے خدا !
خدا ،
وحدتِ آب کے ، عظمتِ باد کے
رازِ نو کے خدا !
قلم کے خدا ، سازِ نو کے خدا !
تبسّم کے اعجازِ نو کے خدا ! —]

دوئی کی آبنا

ہمیں ہیں وہ کہ جن کی اِک نگاہ سے
صدا دوئی کی آبنا کے آرپار اُتر گئی

وہ عشق جس کی عمر

آدمی سے بھی طویل تر
وہ محض اشتہا نہیں
وہ محض کھیل بھی نہیں
وہ آب و نان کا رُکا ہوا سوال بھی نہیں
وہ اپنے ہی وجود کا حسد نہیں
جو موت نے بچھا رکھا ہو ایسا
ناگزیر جال بھی نہیں

یہ ہم،
جو حادثے کے لائے و گل سے یا
نصیب کے غبار سے نہیں اُٹھے
ازل کے حافظے کے درد سے اُٹھے
جو ہوش کے شگاف سے ــــ
جو استوائے جسم و روح سے اُٹھے ــــ
ہمیں ہیں وہ کہ جن کی اِک نگاہ سے
صدا دوئی کی آبنا کے آرپار اُتر گئی
ــــ اور اِس صدا سے ایک ایسا مرحلہ برس پڑا
جو بے نیازِ بُعد تھا
جو مشرقِ وجود تھا
وہ مرحلہ برس پڑا!

ہماری ایک جرأتِ نگاہ سے

تمام لوگ جاگ اُٹھے
صدا کی شمع ہاتھ میں لیے ہوئے
دوئی کی آبنا کے آرپار ڈھونڈھنے لگے
اُسی طلوع کی خبر
جو وقت کی نئی کرن کے پھوٹتے ہی
ساحلِ نمود پر
کم التفات انگلیوں کے درمیاں پھسل گیا !

صدا پکارتی ہے پھر
وہی طلوع جس کو رو چکے تھے تم
ابھی ابھی
دوئی کی آبنا کے ساحلوں کی مرگ ریت پر
جھلک اُٹھا !

گماں کا ممکن — جو تو ہے میں ہوں!

کریم سورج،
جو ٹھنڈے پتّھر کو اپنی گولائی
دے رہا ہے
جو اپنی ہمواری دے رہا ہے —

[وہ ٹھنڈا پتّھر جو میرے مانند
بھورے سبزوں میں
دورِ ریگ و ہوا کی یادوں میں لوٹتا ہے]
جو بہتے پانی کو اپنی دریا دلی کی
سرشاری دے رہا ہے
— وہی مجھے جانتا نہیں ہے
مگر مجھی کو یہ وہم شاید
کہ آپ اپنا ثبوت اپنا جواب ہوں میں !
مجھے وہ پہچانتا نہیں ہے
کہ میری دھیمی صدا
زمانے کی جھیل کے دوسرے کنارے
سے آ رہی ہے

یہ جھیل وہ ہے کہ جس کے اوپر
ہزاروں انساں
اُفق کے متوازی چل رہے ہیں
اُفق کے متوازی چلنے والوں کو پار لاتی ہیں
وقت لہریں —
جنھیں تمنّا ، مگر ، سماوی خرام کی ہو
انھی کو پاتال زمزموں کی صدا سناتی ہیں
وقت لہریں

انھیں ڈبوتی ہیں وقت لہریں !

تمام ملّاح اِس صدا سے سدا ہراساں ، سدا گریزاں
کہ جھیل میں اک عمود کا چور چھپ کے بیٹھا ہے
اُس کے گیسو اُفق کی چھت سے لٹک رہے ہیں ——
پکارتا ہے : "اب آؤ ، آؤ !
ازل سے میں منتظر تمھارا ——
میں گنبدوں کے تمام رازوں کو جانتا ہوں
درخت ، مینار ، برج ، زینے مرے ہی ساتھی
مرے ہی متوازی چل رہے ہیں
میں ہر ہوائی جہاز کا آخری بسیرا
سمندروں پر جہاز رانوں کا میں کنارا
اب آؤ ، آؤ !
تمھارے جیسے کئی فسانوں کو میں نے اُن کے
ابد کے آغوش میں اُتارا ۔"
تمام ملّاح اِس کی آواز سے گریزاں
اُفق کی شاہراہِ مبتذل پر تمام سہمے ہوئے خراماں ——
مگر مساوی خرام والے
جو پست و بالا کے آستاں پر جمے ہوئے ہیں
عمود کے اِس طناب ہی سے اُتر رہے ہیں
اِسی کو تھامے ہوئے بلندی پہ چڑھ رہے ہیں !

اسی طرح میں بھی ساتھ اِن کے اُتر گیا ہوں

اور ایسے ساحل پر آ لگا ہوں
جہاں خدا کے نشانِ پا نے پناہ لی ہے
جہاں خدا کی ضعیف آنکھیں
ابھی سلامت بچی ہوئی ہیں
یہی سماوی خرام میرا نصیب نکلا
یہی سماوی خرام جو میری آرزو تھا ــــ

مگر نجانے
وہ راستہ کیوں چنا تھا میں نے
کہ جس پہ خود سے وصال تک کا گماں نہیں ہے ؟
وہ راستہ کیوں چنا تھا میں نے
جو رک گیا ہے دلوں کے ابہام کے کنارے ؟
وہی کنارا کہ جس کے آگے گماں کا ممکن
جو تو ہے میں ہوں !

مگر یہ سچ ہے ،
میں تجھ کو پانے کی [خود کو پانے کی] آرزو میں
نکل پڑا تھا
اس ایک ممکن کی جستجو میں
جو تو ہے میں ہوں
میں ایسے چہرے کو ڈھونڈتا تھا
جو تو ہے میں ہوں

میں ایسی تصویر کے تعاقب میں گھومتا تھا
جو تو ہے میں ہوں !

میں اِس تعاقب میں
کتنے آغاز گن چکا ہوں
[میں اُس سے ڈرتا ہوں جو یہ کہتا
ہے مجھ کو اب کوئی ڈر نہیں ہے]
میں اِس تعاقب میں کتنی گلیوں سے ،
کتنے چوکوں سے ،
کتنے گونگے مجسّموں سے ، گزر گیا ہوں
میں اِس تعاقب میں کتنے باغوں سے ،
کتنی اندھی شراب راتوں سے ،
کتنی باہوں سے ،
کتنی چاہت کے کتنے بپھرے سمندروں سے
گزر گیا ہوں
میں کتنی ہوش و عمل کی شمعوں سے ،
کتنے ایماں کے گنبدوں سے
گزر گیا ہوں
میں اِس تعاقب میں کتنے آغاز کتنے انجام گن چکا ہوں ——
اب اس تعاقب میں کوئی در ہے
نہ کوئی آتا ہوا زمانہ
ہر ایک منزل جو رہ گئی ہے

فقط گزرتا ہوا فسانہ

تمام رستے ، تمام بوجھے سوال ، بے وزن ہو چکے ہیں
جواب ، تاریخ روپ دھارے
بس اپنی تکرار کر رہے ہیں ——
”جواب ہم ہیں —— جواب ہم ہیں ——
ہمیں یقیں ہے جواب ہم ہیں ——“
یقیں کو کیسے یقیں سے دہرا رہے ہیں کیسے !
مگر وہ سب آپ اپنی ضد ہیں
تمام ، جیسے گماں کا ممکن
جو تو ہے میں ہوں !

تمام کُندے [تو جانتی ہے]
جو سطحِ دریا پہ ساتھ دریا کے تیرتے ہیں
یہ جانتے ہیں یہ حادثہ ہے ،
کہ جس سے اِن کو ،
[کسی کو] کوئی مفر نہیں ہے !
تمام کُندے جو سطحِ دریا پہ تیرتے ہیں ،
نہنگ بننا —— یہ اُن کی تقدیر میں نہیں ہے
[نہنگ کی ابتدا میں ہے اک نہنگ شامل
نہنگ کا دل نہنگ کا دل !]
نہ اُن کی تقدیر میں ہے پھر سے درخت بننا
[درخت کی ابتدا میں ہے اک درخت شامل
درخت کا دل درخت کا دل !]
تمام کُندوں کے سامنے بند واپسی کی
تمام راہیں

وہ سطحِ دریا پہ جبرِ دریا سے تیرتے ہیں
اب اِن کا انجام گھاٹ ہیں جو
سدا سے آغوش وا کیے ہیں
اب اِن کا انجام وہ سفینے
ابھی نہیں جو سفینہ گر کے قیاس میں بھی
اب اِن کا انجام
ایسے اوراق جن پہ حرفِ سیہ چھپے گا
اب اِن کا انجام وہ کتابیں ——
کہ جن کے قاری نہیں ، نہ ہوں گے
اب اِن کا انجام ایسے صورت گروں کے پردے
ابھی نہیں جن کے کوئی چہرے
کہ اُن پہ آنسو کے رنگ اُتریں ،
اور ان میں آیندہ
اُن کے رؤیا کے نقش بھر دے !

غریب کُندوں کے سامنے بند واپسی کی
تمام راہیں
بقائے موہوم کے جو رستے کُھلے ہیں اب تک
ہے اُن کے آگے گماں کا ممکن ——
گماں کا ممکن ، جو تو ہے میں ہوں !
جو تو ہے ، میں ہوں !

حَسَن کوزہ گر

(۴)

جہاں زاد ، کیسے ہزاروں برس بعد
اک شہرِ مدفون کی ہر گلی میں
مرے جام و مینا و گلداں کے ریزے ملے ہیں
کہ جیسے وہ اِس شہرِ برباد کا حافظہ ہوں !

[حسن نام کا اک جواں کوزہ گر ـــــ اک نئے شہر میں ـــــ
اپنے کوزے بناتا ہوا ، عشق کرتا ہوا
اپنے ماضی کے تاروں میں ہم سے پرویا گیا ہے
ہمیں میں [کہ جیسے ہمیں ہوں] سمویا گیا ہے
کہ ہم تم وہ بارش کے قطرے تھے جو رات بھر سے ،
[ہزاروں برس رینگتی رات بھر]
اک دریچے کے شیشوں پہ گرتے ہوئے سانپ لہریں
بناتے رہے ہیں ،
اور اب اس جگہ وقت کی صبح ہونے سے پہلے
یہ ہم اور یہ نوجواں کوزہ گر
ایک رؤیا میں پھر سے پروئے گئے ہیں !]

جہاں زاد ـــــ
یہ کیسا کہنہ پرستوں کا انبوہ
کوزوں کی لاشوں میں اترا ہے
دیکھو !
یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں
کبھی جام و مینا کی لم تک نہ پہنچیں
یہی آج اس رنگ و روغن کی مخلوقِ بے جاں
کو پھر سے الٹنے پلٹنے لگے ہیں
یہ اِن کے تلے غم کی چنگاریاں پا سکیں گے

جو تاریخ کو کھا گئی تھیں ؟

وہ طوفان ، وہ آندھیاں پا سکیں گے

جو ہر چیخ کو کھا گئی تھیں ؟

انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے ـــــ

[مرے اور اِس نوجواں کوزہ گر کے ؟]

انھیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے ؟

انھیں کیا خبر کون سے حسن سے ؟

کون سی ذات سے ، کس خدوخال سے

میں نے کوزوں کے چہرے اُتارے ؟

یہ سب لوگ اپنے اسیروں میں ہیں

زمانہ ، جہاں زاد ، افسوں زدہ برج ہے

اور یہ لوگ اُس کے اسیروں میں ہیں ـــــ

جواں کوزہ گر ہنس رہا ہے !

یہ معصوم وحشی کہ اپنے ہی قامت سے ژولیدہ دامن

ہیں جویا کسی عظمتِ نارسا کے ـــــ

انھیں کیا خبر کیسا آسیبِ مبرم مرے غار سینے پہ تھا

جس نے مجھ سے [اور اِس کوزہ گر سے] کہا :

"اے حسن کوزہ گر ، جاگ

دردِ رسالت کا روزِ بشارت ترے جام و مینا

کی تشنہ لبی تک پہنچنے لگا ہے !"

یہی وہ ندا ، جس کے پیچھے حسن نام کا

یہ جواں کوزہ گر بھی
پیا پے رواں ہے زماں سے زماں تک،
خزاں سے خزاں تک!

جہاں زاد میں نے ــــ حسن کوزہ گر نے ــــ
بیاباں بیاباں یہ دردِ رسالت سہا ہے
ہزاروں برس بعد یہ لوگ
ریزوں کو چنتے ہوئے
جان سکتے ہیں کیسے
کہ میرے گِل و خاک کے رنگ و روغن
ترے نازک اعضا کے رنگوں سے مل کر
ابد کی صدا بن گئے تھے؟
میں اپنے مساموں سے، ہر پور سے،
تیری باہوں کی پہنائیاں
جذب کرتا رہا تھا
کہ ہر آنے والے کی آنکھوں کے معبد پہ جا کر چڑھاؤں ــــ
یہ ریزوں کی تہذیب پالیں تو پالیں
حسن کوزہ گر کو کہاں لا سکیں گے؟
یہ اُس کے پسینے کے قطرے کہاں گن سکیں گے؟
یہ فن کی تجلّی کا سایہ کہاں پا سکیں گے؟
جو بڑھتا گیا ہے زماں سے زماں تک

خزاں سے خزاں تک

جو ہر نوجواں کوزہ گر کی نئی ذات میں
اور بڑھتا چلا جا رہا ہے !
وہ فن کی تجلّی کا سایہ کہ جس کی بدولت
ہمہ عشق ہیں ہم
ہمہ کوزہ گر ہم
ہمہ تن خبر ہم ، ہمہ بے خبر ہم
خدا کی طرح اپنے فن کے خدا سربسر ہم !
[آرزوئیں کبھی پایاب تو سَریاب کبھی ،
تیرنے لگتے ہیں بے ہوشی کی آنکھوں میں کئی چہرے
جو دیکھے بھی نہ ہوں
کبھی دیکھے ہوں کسی نے تو سراغ اُن کا
کہاں سے پائے ؟
کس سے ایفا ہوئے اندوہ کے آداب کبھی
آرزوئیں کبھی پایاب تو سَریاب کبھی !]

یہ کوزوں کے لاشے ، جو اِن کے نیے ہیں
کسی داستانِ فنا کے وغیرہ وغیرہ ــــ
ہماری اذاں ہیں ، ہماری طلب کا نشاں ہیں
یہ اپنے سکوتِ اجل میں بھی یہ کہہ رہے ہیں :
"وہ آنکھیں ہمیں ہیں جو اندر کُھلی ہیں

تمھیں دیکھتی ہیں ، ہر اک درد کو بھانپتی ہیں
ہر اِک حسن کے راز کو جانتی ہیں
کہ ہم ایک سنسان حجرے کی اُس رات کی آرزو ہیں
جہاں ایک چہرہ ، درختوں کی شاخوں کے مانند
اِک اور چہرے پہ جھک کر ، ہر انساں کے سینے میں
اِک برگِ گل رکھ گیا تھا
اُسی شب کا دزدیدہ بوسہ ہمیں ہیں !"

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	درست
٧٦	١٥	حافظے کی	حافظے کے

